

سعادت حسن منٹو

Kitabo Sunnat WhatsApp Library <https://www.kitabosunnat.com> +92 333 7516944



تلخ، ترش، شیریں

انتساب

حفظ جاوید کے نام

CSS, PCS, FPSC, SPSC, NTS, GAT, NAT,
MCAT, ECAT Various Jobs & Exams
Preparation Material and Sindhi,
Urdu & English Litrary Books, News-
papers and Headlines etc

Kutabkhano
Whatsapp Library

ADMIN: AMEER ADNAN
+92 333 7516944



دیواروں پر لکھنا

کمل ایک دیوار پر یہ حکم لکھا نظر آیا ”اس دیوار پر لکھنا منع ہے“ میں نے سوچا، جب دیوار کے مالک کو اپنی دیوار پر کسی قسم کی تحریر پسند نہ تھی تو یہ حکم ہی کیوں لکھوایا۔ غالباً اسی نفسیاتی غلطی کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ساری دیوار بے شمار چھوٹے اور موٹے بد خط اور خوش خط حروف سے بھری ہوئی تھی۔ لیکن شہر کی قریب قریب ہر دیوار بغیر کسی نفسیاتی تحریک لکھنے لکھانے کا نشانہ بن رہی ہے جس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دیواروں پر لکھنا انسان کی فطرت میں داخل ہے جس طرح ہم کھاتے ہیں، پیتے ہیں، اسی طرح دیواروں پر لکھتے بھی ہیں۔

میری بچی ہے ڈیڑھ برس کی۔ اس نے مجھے کانگوں پر لکھتے دیکھا ہے لیکن جب اس کے ہاتھ میں پہلی بار پنسل آئی تو اس نے کانگوں کے بجائے میرے کمرے کی دیواریں ہی کالی کیں۔ وہ اس شغل میں مصروف تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ دیواروں پر سیاہ لکیریں کھینچ کر ایک عجیب قسم کی تسکین محسوس کر رہی ہے۔ شروع شروع میں انسان اس تسکین و تفریح ہی کے لیے لکھتا ہے لیکن بعد میں اپنا پیٹ پالنے کے لیے لکھتا ہے۔ ابتداء میں تو اس کی تحریر صرف دیواریں کالی کرتی ہیں لیکن آگے چل کر اس کی تحریریں دیواریں بناتی بھی ہے اور ڈھاتی بھی ہے۔ کوئی چغتائی بن جاتا ہے اور کوئی اقبال۔۔۔۔۔۔ اور بعض دیواروں پر لکھ لکھ ایسی مصوری اور شاعری کرتے ہیں کہ جسے انسان دیکھ کر نقش بہ دیوار ہو جاتا ہے۔

کتابی ادب ہے، اخباری ادب ہے، رسائی ادب ہے اسی طرح دیواری

ادب بھی ہے۔ کاغذ پہ صرف یہ نتیجہ نکال کے رکھا جاسکتا ہے لیکن دیوار پر آپ کا کلمہ، گردے، دل پتھر پھڑے سبھی نکال کر رکھ سکتے ہیں۔ سکولوں، کالجوں اور منڈوؤں کے ہاتھروں میں جانیے۔ ان کی دیواروں پر آپ کو جملہ اعضائے نسوانی کی تصویریں نظر آجائیں گی۔

دیواروں پر تو خیر انسان لکھتا ہی ہے لیکن بیت الخلاء کی دیواروں پر ضرور لکھتا ہے۔ مسجد میں چلے جائیے اس کے غسل خانے کی دیواروں پر بھی آپ کو ترقی پسند ادب اور ترقی پسند مصوری بکھری نظر آئے گی۔ یہی نہیں آپ ان دیواری تحریروں سے ضروری معلومات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ مسجد کے مؤذن صاحب کس طبیعت کے مالک ہیں۔ امام صاحب کو کون سے کمانے مرغوب ہیں۔ سکول کا کون سا استاد میر تقی میر کا تتبع کرتا ہے۔ کالج میں پرنسپل صاحب مقبول ہیں یا نہیں۔ اسی طرح کی اور سینکڑوں باتیں آپ کو ایک ہی نشست میں ان دیواروں کے مطالعے سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

ایک کہانی کے سلسلے میں بمبئی کی ایک فلم کمپنی سے میرا معاملہ ہو رہا تھا۔ ایگریمنٹ پر صرف دستخط کرنے باقی تھے کہ مجھے ہاتھروں میں جانا پڑا۔ سامنے دیوار پر زرد چاک سے یہ لکھا ہوا نظر آیا اور تو سب ٹھیک ہے لیکن پگاریوں نہیں دیتے؟ پگار کا مطلب ہے تنخواہ میں نے ایگریمنٹ پر دستخط نہ کئے۔ اس فلم کمپنی میں اور سب ٹھیک تھا۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ بالکل درست تھی لیکن کام کرنے والوں کو چھ مہینے سے تنخواہ نہیں دی گئی تھی۔

دیوار پر لکھنا ایسا ہی ہے جیسے سر بازار آواز بلند کر کے کوئی اعلان کر دیا جائے

لیکن بیت الخلاء کی دیواروں پر وہ علوم لکھے جاتے ہیں جن کے مطالعے کے لیے سکون تہائی اور اطمینان قلب درکار ہوتا ہے۔ مختصر نشست ہی میں آپ ان چھوٹی چھوٹی انبیریوں سے روزمرہ کی زندگی کے سینکڑوں اسرار معلوم کر سکتے ہیں۔ بھاری بھر کم کتابوں کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں۔ ذرا گردن اٹھائی اور ہیولک ایلس کی چاروں جلدوں کا نچوڑ دیکھ لیا۔

نائب کا ایک شعر ہے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

چونکہ ایسی دیواروں پر لکھتے وقت دم تحریر فرشتے نہیں ہو سکتے اس لیے پکڑنے پکڑانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دیواری ادب اور مصوری کی یہ شاخ حکومت کے احتساب اور اس کے خوف سے بالکل پاک رہی ہے۔ انسان ان دیواروں پر تعزیرات کی تمام دفعات سے محفوظ ہو کر اپنے خیالات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ تمام نوع کاریوں سے مبرا۔

اسی چار دیواری کے ایک کونے میں عرصہ ہوا یہ فکر خیز تحریر دیکھی تھی ”تمہارے ہاتھ بھی کیسے کیسے کام کرتے ہیں“ اور دیواری مصوری کی اس خاص صنف میں آج کے نقاد ماڈرن سوئی ری لنگ مصوری کی نمایاں جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

دیواروں پر لکھنے اور نقش و نگار بنانے کے لیے خاص روشنائی یا رنگوں کی ضرورت نہیں۔ کونلہ، کھریا، مٹی، نیم پختہ اینٹ کا ٹکڑا، دودھ پتھری، گیری، چونا، کتھا، تار کول ان میں سے جو بھی Inspiration کے وقت موجود ہو۔ آپ

استعمال کر سکتے ہیں۔ قلم اور برش نہیں تو انگلی ہی سے کام لیا جاسکتا ہے اور اگر کوئی بھی ذرا پیسہ نہیں تو ناخنوں ہی سے کرید کرید کر آپ اپنا شوق پورا کر سکتے ہیں۔

فارسی محاورہ ہے۔ دیوار ہم گوش وارد، لیکن جب دیواروں پر لکھا جاتا ہے تو اس کے کانوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ لکھنے والے اصل میں دیوار کے کانوں ہی میں سرگوشیاں کرتے ہیں تاکہ کان کی یہ کچی چیزیں جو کچھ سنیں دوسروں تک پہنچائیں۔

عرصہ ہوا ماہور سے پشاور تک سفر کرتے ہوئے فرنیئر میل کے ایک ڈبے کی چوٹی دیوار پر میں نے یہ تحریر دیکھی تھی ”بکلی کے تاروں پر ابا بیلوں کے جوڑے بیٹھے ہیں لیکن میرا پہلو خالی ہے، مجھ سے کوئی محبت نہیں کرتا“ ڈیڑھ مہینے کے بعد اتفاق سے ماہور واپس آتے ہوئے مجھے اسی ڈبے میں جگہ ملی۔ اس عبارت کے نیچے نسوانی خط میں یہ الفاظ لکھے تھے ”بد نصیب ہے وہ انسان جس کا دل محبت سے خالی ہے۔“

کیا جب کہ یہ دونوں دل جو محبت سے خالی تھے ایک روز وقت کے تاروں پر مل بیٹھے ہوں۔

ہوٹلوں میں آپ نے اکثر دیواروں پر یہ شعر دیکھا ہوگا

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اگر آپ غریب الوطن ہیں تو یہ تحریر دیکھ کر یقیناً آپ کا دل محزون ہو جائے گا دیواروں سے بعض اصحاب ڈائری کا کام بھی لیتے ہیں۔ ٹیلی فون کے برابر کی

دیوار پر آپ نے کئی نمبر اور نام یادداشت کے طور پر لکھے ہوئے دیکھے گے۔ ہاسٹل کے کمروں کی دیواروں پر ایسی تحریریں عام دکھائی دیتی ہیں۔ 2-6-45 کو دودھ شروع کیا گیا۔ دھوبی کو کپڑے دینے گئے 4-7-45

بمبئی کے ایک ہوٹل میں جہاں عام طور پر جہاز کے خلاسی ٹھہرتے تھے۔ میں نے بادبانوں، مستولوں اور جھنڈوں کی تصویروں کے ساتھ ساتھ ذیل کی تحریریں دیکھیں جو اپنا مطلب خود واضح کرتی ہیں۔

کل من علیہما فان

فرانس، فرانس، فرانس میوزیل نمبی

ہائے!

سیرت کے ہم گلام ہیں سورت ہوئی تو کیا

پانچوں وقت نماز پڑھا کرو

اوجانے والے بالو، الوٹ کے آ، الوٹ کے آ

بقلم خود جان محمد 4-9-47

بقلم خود لکھنے کا شوق بہت زیادہ ہے شاید اس لیے کہ اس سے وقتی طور پر انسان کو خودی کی تسلی ہو جاتی ہے۔ جس طرح ہمالہ کی چوٹیاں مسخر کرنے پر سیاح اپنے جھنڈے گاڑ آتے ہیں۔ اسی طرح کوئی نئی جگہ دیکھنے پر ہم چھوٹے چھوٹے انسان اپنا نام لکھ آتے ہیں۔ اگر آپ کو کبھی قطب صاحب کی الاٹھ کی آخری منزل تک پہنچنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں تانبے کے کڑے اور پتھروں پر ہزاروں بقلم خود کنندہ ہیں۔ امریکی، روسی اور انگریز سپاہیوں نے جب

رائخ شتاگ کی عمارت پر قبضہ کیا تو اس کی دیواروں پر اپنا نام لکھنے میں فاتحانہ مسرت محسوس کی۔

دیواروں پر قسمت بھی آزمائی جاتی ہے۔ چنانچہ آپ نے ہوٹلوں، گھروں اور سکولوں کی دیواروں پر چار لکھروں میں گھرے ہوئے چلیپا کے نشان اور دائرے اکثر دیکھے ہوں گے۔ حساب کے سوال بھی حل کئے جاتے ہیں۔ سیاست کی گھنٹیاں بھی سلجھائی جاتی ہیں اور اپنے دل کی بھڑاس بھی نکالی جاتی ہے۔

مجھے مشہور راکٹر اشوک سمار کے باتھ روم میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس کی ایک دیوار پر بے شمار گیمبوڑوں کے نام، ان کے وزن اور پینڈی کیپ وغیرہ لکھے تھے۔ اشوک نے مجھ سے کہا کہ ریس میں جانے سے پہلے وہ اسی دیوار پر سے اپنے لیے ٹپ نکالا کرتا ہے۔

قلو پطرب کو ابھی بیٹھارس لگا تھا جب سکندر یہ میں یہ رواج عام تھا کہ عشاق اپنی پسندیدہ عورت کا نام دیوار پر لکھ دیتے تھے۔ اپنا نام پڑھ کر عورت سواہ سنگھار کئے اپنے عاشق کے انتظار میں وہاں کھڑی رہتی تھی۔ انسان کے دیواروں پر لکھنے اور نقاشی کرنے کے اس فطری شوق ہی کی بدولت اتھینا اور ایلورا کے فرسکو نظر آتے ہیں۔ اس کی معراج دیکھنا ہو تو روما کے عظیم الشان کھیلوں کی دیواروں کے نہ مٹنے والے نقش موجود ہیں۔ سچ پوچھئے تو یورپ کے فن مصوری کا نصف بہتر آپ کو وہاں کی دیواروں کو نہ مٹنے والے نقش موجود ہیں۔ سچ پوچھئے تو یورپ کے فن مصوری کا نصف بہتر آپ کو وہاں کی دیواروں پر ہی ملے گا اور مغلوں کی بے مثل خطاطی، نقاشی اور مصوری کے نمونے بھی دیواریں ہی پیش کریں گی۔

اشتہار بازی میں بھی تحریریں پیش پیش ہیں۔ شہر لاہور کی شاید ہی کوئی ایسی دیوار ہو جس پر آپ کو اشتہار لکھا ہوا نظر نہ آئے۔ بال صفا پاؤڈر سے لے کر اگانے کے تیل تک جتنی دوائیں ہیں۔ آپ ان کا اشتہار دیواروں پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ پطرس صاحب نے اپنے مشہور مضمون ”لاہور کا جغرافیہ“ میں دیواروں کی سطح پر لکھے ہوئے اشتہاروں کے فوائد بیان کئے ہیں۔

ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب خدشہ نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ کچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا تھا اور لوٹنے تک وہاں اہل لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مشردہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ جہاں بحروف جلی ”محمد علی دندان ساز“ لکھا ہے وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے جہاں ”بکلی، پانی بھاپ کا بڑا ہسپتال“ لکھا ہے وہاں ڈاکٹر اقبال رتے ہیں خالص گھی کی مٹھائی اتیاز علی تاج کا مکان ہے۔ کرشنا بیوٹی کریم شالہ مار باغ کو اور ”کھانسی کا مجرب نسخہ“ جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

بمبئی میں کارپوریشن نے ایک بہت لمبی دیوار جو کوئینز روڈ پر واقع ہے اور برقی ریل کی پٹری کے متوازی دور تک چلی گئی ہے۔ اشتہاروں کے لیے مخصوص کر دی ہے۔ اس دیوار کے پیچھے پارسیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کا قبرستان اور ہندوؤں کا شمشان ہے۔ معلوم نہیں مذہبی نقطہ نظر سے بمبئی کارپوریشن کی حرکت درست ہے یا نا درست مگر یہ دیوار جس پر ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک فلموں کے بڑے بڑے اشتہار پینٹ ہیں، ایک عجیب و غریب تضاد پیش کرتی

ہے۔ عتب میں ہزاروں انسان دفن ہیں لیکن پیشانی پر پری چہرہ نسیم بانو کی یہ بڑی تصویر نظر آتی ہے۔ ذرا آگے بڑھتے تو موئے موئے حروف ہیں ”ہنسواے دنیا والو“ کا اشتہار دکھائی دیتا ہے۔ دیوار کے پیچھے جلتی ہوئی چتا سے دھواں اٹھ رہا ہے لیکن سامنے نیو تھیٹر کے فلم ”زندگی“ کا شوخ رنگ اشتہار چمک رہا ہے۔

پچھلے دنوں ایسٹریڈ ویلکی آف انڈیا میں اسی دیوار کو متعدد رنگین تصویریں ایک مضمون کے ساتھ شائع ہوئی تھیں جس میں اشتہاری مصوری کی اس جدید صنف کو بہت سراہا گیا تھا۔ لیکن بچپن میں ہم جب چھوٹی چھوٹی گلیریاں، دو تیریاں دو میریاں کا دلچسپ کھیل کھیلتے تھے اور دیواروں پر کونلے سے ان گنت لکیریں کھینچتے تھے تو بزرگوں نے ہمارے اس فعل کو ہمیشہ مذمت کی۔

ادھر روس میں ان دیواروں تحریروں نے انقلاب میں بیٹش از بیٹش حصہ لیا۔ پریس پر حکومت کا بہت بڑا احتساب تھا اس لیے دیواروں ہی کے ذریعے سے اخباروں اور پمفلٹوں کا کام لیا گیا۔ اس ذریعے نے بعد میں شکل بدلی اور مزدوروں کا ”دیواری اخبار“ یا ”وال پیپر“ بن گیا۔

جب تک دیواریں سامت ہیں ان پر انسان لکھتا اور نقش و نگار بناتا ہی رہے گا لیکن پچھلے دنوں اس نے ایک قدم ترقی کی طرف بڑھایا اور فضاؤں پر لکھنا شروع کیا۔ بیئر سوپ بنانے والوں نے ایک ہوا بازی کی خدمت حاصل کی جس نے جہاز کی دم سے گاڑھا دھواں چھوڑ کر کچھ اس طرح قلابازیاں کھائیں کہ فضاء میں اس صابن کا دھواں دھار نام کچھ عرصے کے لیے معلق ہو گیا۔

بمبئی میں جب اس فضائی اشتہار بازی کا مظاہرہ ہوا تو کارپوریشن نے بیئر ز

سو پ بنانے والوں سے فضاء استعمال کرنے کا کرایہ طلب کیا ماحامہ عدالت تک
پہنچا فیصلہ کارپوریشن کے حق میں ہوا کہ فضاء بھی اس کے حاتمہ انتظام میں شامل
ہے۔

☆☆☆☆☆

ناک کی قسمیں

خدا نے جس طرح پانچ انگلیاں یکساں نہیں بنائیں اسی طرح انسانوں کی ناک بھی ایک سی نہیں بنائی بعض چھٹی ہوتی ہیں، بعض اونچی، کچھ موٹی، کچھ تلی چھوٹی اور لمبی اور بعض اوقات اتنی لمبی کہ

آئی جو ان کی ناک تو آتی چلی گئی

اس ناک کے مقابلے میں چکلے کی ناک ہوتی ہے۔ چہرے پر جو صرف ناک کے نشان کا کام دیتی ہے۔ ایسی ناکوں کے مالک بڑے کٹر قسم کے رجائی ہوتے ہیں کیونکہ وہ اسی امید کے سہارے سانس لیتے رہتے ہیں کہ ایک روز صبح اٹھتے ہی یہ بے معلوم سانس ناک میں تبدیل ہو جائے گا۔

عام استعمال میں پہلوں یعنی پھولی ہوئی چھٹی نیٹھی ستواں اور اونچی ناک ہی آتی ہے لیکن شاعروں کو صرف ستواں ناک ہی بھاتی ہے۔ کبھی اسے اپنی تلوار سے تشبیہ دی جاتی ہے، کبھی کتار یعنی ابل کی پھلی سے۔ لیکن تلوار اور ناک کا رشتہ کچھ زیادہ ہی استوار ہی اس لیے کہ دشمنی کے وقت تلوار ہی اس کے درپے ہوتی ہے۔ دشمن کی ناک کاٹنے کا تو رواج عام ہے۔

یونپنی کے دیہاتوں میں خوبصورت ناک کو سوائے تشبیہ دی جاتی ہے۔ کسی نے کہا ہے ہمارے سبزہ باغ میں سواچونچ کہنے ہیں شاید نظر کے تیروں کے علاوہ وہاں ناک کے سوائے بھی عاشقوں کے دل میں پیوست ہوتے ہیں۔

پنجابی شاعر تشبیہ دینے کے معاملے میں ہمیشہ ترقی پسند رہے ہیں۔ چنانچہ

ایک شاعر نے کہا ہے ”نک تموم دی تری“ یعنی ناک حسن کی ٹری ہے ہو سکتا ہے شاعر نے اپنے معشوق کے چہرے کو پکی ہوئی وال سمجھ کر لہسن کا بگھار دے دیا ہو۔ پنجابی شاعری کے ناخدا حضرت وارث شاہ پنجاب کی مثالی مشوقہ بیر سیال کا سراپا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

ہونجھ سرخ یا قوت جیویں الال چمکن، ٹھوڈی سیب والایتی

سارو چوں

نک الف حسینی دا پہلے، زلف ناگ خزانے دی بارو چوں

بیر کی اس ناک کو اگر گراپی تلووار، اہلی کی پھلی، لہن کی ٹری اور سونے میں خلط ملط کر دیا جائے تو چغتائی ناک بن جاتی ہے۔ خان بہادر عبدالرحمن چغتائی کے مو قلم کی ایجاد سے دیکھ کر اللہ اور اس کے بندے، دونوں کی قدرت یاد آ جاتی ہے۔ شروع شروع میں ناک کا مصرف سو گھنا تھا چنانچہ حیوانوں میں ابھی تک اس کا ذوق صحیح موجود ہے۔ کتے اپنے روزمرہ کی زندگی میں زیادہ تر قوت شامہ ہی سے کام لیتے ہیں لیکن چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اس لیے اس نے جوتے اور کپڑے سو گھنا متروک قرار دیا اور اپنے لیے عریات بنا لیے۔ چنانچہ اونچی سوسائٹی میں لونڈر اور سینٹ کے انتخابات ہی سے انسان کے مذاق کی بندی و پستی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

ناک سو گھنے جی کے لیے تھپی اور کسی حد تک اب بھی ہے لیکن اب اس کے اور استعمال بھی نکل آئے ہیں عورتیں ایک زمانہ سے اسے چھدواری ہیں۔ شروع شروع میں دونوں طرف بڑے سوراخ کرانے اور بڑی بڑی تختیں پہننے کا رواج

تھا۔ آہستہ آہستہ ایک سوراخ جسے بے کہتے ہیں کم ہوا اور ساتھ ہی ساتھ نقوں کا سائز بھی چھوٹا ہو گیا۔ اونچی سوسائٹی میں ان دنوں ناک چھدوانے کا رواج بہت محبوب ہے۔ ایک ازدواجی اشتہار ملاحظہ ہو:

”ضرورت ہے ایک اونچے گھرانے کی ناکتھا تعمیر یافتہ خوش شکل لڑکی جس کی ناک چھدی ہوئی نہ ہو۔“

اونٹوں کی اونچی نیچی سوسائٹی میں ایسی کوئی پابندی نہیں چنانچہ ناک چھدوانے اور ٹیکل پہننے کا رواج ان کے ہاں عام ہے۔

عورتوں کی ناک کے حسن کی افزائش کے لیے بے شمار زیور ایجاد ہوئے جن میں نتھ، کیل، بلاک، (یہ ناک کی درمیانی دیوار کو چھید کے پہنا جاتا ہے) اور لونگ مشہور ہیں۔

ایک ”لونگ پہنی ٹیار“ کے بارے میں پنجاب کے کسی دیہاتی کی یہ بولی بہت مشہور ہے۔

تیرے لونگ دا پیا لشکارا

تے ہالیاں نے ہل ڈک لے

تیری لونگ نے جب چمک پیدا کی تو ہل چلانے والوں نے اس خیال سے اپنے ہل روک لیے کہ بجلی چمکی ہے ممکن ہے بارش ہونے لگے

’بعض ناکوں کو زیور کی حاجت ہی نہیں ہوتی ایک شاعر کہتا ہے

ناک میں نیم کا فقط تنکا

شوخی چالاکی اقتضا سن کا

پچھلے پچاس ساٹھ برس سے ناک کا ایک اور بھی مصرف معلوم ہوا ہے چنانچہ آنکھوں کی بینائی درست کرنے کے لیے جب عینک ایجاد ہوئی تو اسے ناک پر بٹھا دیا گیا۔ سیدھا راستہ بتانے میں تو عام طور پر اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ”ناک کی سیدھ چلے جائے“

پر امری سکول میں جب کسی استاد کو اپنے شاگرد کے طمانچہ لگانا ہوتا ہے تو وہ سہولت کی خاطر اپنا ہاتھ گال پر اچھی طرح جمانے کے لیے اس کی ناک دوسرے ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے لیکن مغربی ممالک میں ہمارے پر امری سکولوں کے استاد کی اس سچ سے ابھی تک استفادہ نہیں کیا گیا۔ ایران میں البتہ جب کسی معتبوب کو محفل سے باہر نکالنا مقصود ہو تو بیک بنی و دو گوش باہر نکالا جاتا ہے لیکن ہمیں تو ناک کی قسمیں بیان کرنی ہیں۔

بڑی ناک، اونچی ناک، پھلواں ناک، چپٹی ناک، بیٹھی ناک اور چھلکی سی ناک کا شمار جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، خوبصورت ناکوں میں نہیں ہوتا لیکن محاورے میں بڑی اور اونچی ناک کا مرتبہ بہت بلند ہے چنانچہ جب کسی کے بارے میں کہا جائے کہ وہ بڑے نام والے، بڑی ناک والے ہیں تو ہمارا سر ہماری ناک سمیت احترام سے جھک جائے گا۔

بڑی اونچی ناک حسن کی علامت ہو نہ ہو عزت کی نشانی ضرور ہے چنانچہ ایسی ناک پر کبھی باطل نہیں بیٹھنے دی جاتی۔ اگر آپ کو کوئی ایسی ناک نظر آ جائے جس پر لکھیاں جھنجھنار ہی ہوں تو آپ کو فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا مالک ذلیل و خوار آدمی ہے۔

ناکوں کی مختلف شکل و صورت کے متعلق پروفیسر نامسن اور مسٹر بکشن جی ہماری رہبری کرتے ہیں۔ ان حضرات کی تحقیق و تدقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اس عضو پر موسم خاص طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کی تشکیل میں چنانچہ یہی کارفرما ہیں۔ پروفیسر نامسن کے نظریئے کے مطابق گرم اور مرطوب آب و ہوا میں رہنے والوں کی ناک اونچی ہوتی ہے لیکن پروفیسر صاحب اپنی تحقیق میں اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکے کہ ایسی آب و ہوا میں رہنے والے باوقار اور باعزت لوگ ہوتے ہیں۔

تاریخی ناکوں میں دو نامکیں بہت مشہور ہیں۔ ایک ناک تو وادی نیل کی معشوقہ قلوپٹرہ کی تھی جس کے متعلق یہ دیر تک سوچا جاتا رہا ہے کہ اگر یہ ایک انچ کا آنٹھوں حصہ بڑی ہوتی تو عیسائیوں کی تاریخ تمدن بالکل مختلف ہوتی۔ قلوپٹرہ کی اس تاریخی ناک کو حیرت ناک کہتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے تصویری سے لوگ ورطہ حیرت میں غرق ہو جاتے ہیں کہ ایک عورت کی ناک تو مومن کی قسمت میں نکیل ڈالنے کا باعث کیوں کر ہو سکتی ہے؟

دوسری ناک کو ہولناک کہتے ہیں یہ بھی مصر ہی کی پیداوار ہے اور ابوالبول کے سنگین چہرے پر حضرت مسیح کی پیدائش سے بہت پہلے کی بیٹھی ہوئی ہے۔

ان دو ناکوں کے علاوہ اور کوئی تاریخی ناک نہیں جس کا ہمیں علم ہو۔ عبرت ناک البتہ ہم نے اکثر آوارہ اور بدچلن عورت کے چہرے پر دیکھی ہے۔ غیرت مند شوہر جب بھی اپنی بدچلن بیوی کو مزادیتا ہے۔ ایسی عبرت ناک معرض موجود میں آ جاتی ہے۔ ایسی ناکوں کو جنہیں سوسائٹی میں ہر قدم پر کٹ جانے کا خطرہ

الحق رہتا ہے۔ خطرناک کہلاتی ہیں۔

تشویش ناک بہت ہی کم دیکھنے میں آتی ہے لیکن جب نظر آجائے تو بعض دیکھنے والوں کی ناک کو تشویش پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر کہیں ہے تو ممکن ہے کہ ہونٹوں کی جنبش میں وہ خود ہی غائب ہو جائے۔ سکتے وقت جو ناک بہت شور مچائے، وہ شورش ناک کے نام سے مشہور ہو جاتی ہے۔

نم ناک سے تو ہر ایک کو واسطہ پڑ جاتا ہے۔ نزلے اور زکام کی حالت میں اچھی، اچھی سے طربناک، نم ناک بن جاتی ہے کہ دیکھنے والوں کی اپنی ناک مارے وحشت کے وحشت ناک ہو جاتی ہے۔

نئی نئی چھدی ہوئی ناک جس کی بے میں سوجھن ہو درد ناک کہلاتی ہے اور رحم ناک اس ناک کو کہتے ہیں جو سردیوں میں اکیلے پڑی ٹھٹھری ہو جس کے دوسرے اعضا تو گرم گرم کپڑوں میں ڈھکے ہوں اور یہ بے چاری تن تنہا سردی کے طمانچے کھا رہی ہو۔ ایسی ناک جسے دیکھ کر دل میں افسوس پیدا ہو کہ ہائے انسان کے چہرے پر ایسی ناک بھی ہو سکتی ہے۔ افسوس ناک کہلاتی ہے افسوس کی حد سے گزر جائے تو اندوہ ناک ہو جاتی ہے لیکن وہ خوبصورت ناک جو غضب ڈھا رہی ہو، غضب ناک کہلائے گی۔

فریب ناک عام طور پر طوائفوں کے چہرے پر پائی جاتی ہے۔ تختی کتنی دفعہ اتر چکی ہے اس کا پتا تماش بین حضرات کو ان ناکوں سے کبھی نہیں چلا۔ فریب کھا کر ان تماش بین حضرات میں سے اکثر کی ناک خشناک ہو جاتی وہ لگی لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے۔

مسنے کہ بعد از جنگ یا دی آید بر بینی خود باید زد
 شرم سے عام طور پر انسان کی پیشانی عرق آلود ہوتی ہے لیکن اگر شرم کا
 احساس بہت ہی شدید ہو تو ناک پر بھی پسینے کی بوندیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ ایسی
 ناک کو شرم ناک کہا جائے گا اور وہ ناک جس کے تصویر ہی سے خوف و ہراس جاری
 ہو جائے، خوف ناک کہا جائے جانے کی مستحق ہے۔

چکنی اور تمکیلی ناک کا شمار خاندانی ناکوں میں نہیں ہوتا۔ انگریزی سوسائٹی
 میں تو خاص طور پر ایسی ناک بہت ہی بری قرار دی گئی ہے۔ چنانچہ ان کی چکنائٹ
 اور چمک دور کرنے کے لیے آئے دن دوائیں ایجاد ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے
 یہاں ایسی ناک کو تاناک کہتے ہیں۔ اس لیے کہ دوسری غیر تمکیلی ناکیں اب ان
 کی تاب نہیں لاسکتیں۔

ایک ناک جو حال ہی میں مولانا چراغ حسن حسرت نے دریافت کی ہے خضر
 ناک ہے۔ خولہ خضر کی بند ناک سے جس کے نتھنوں میں پانی کھستا ہی نہیں۔ اس ناک
 کا کوئی تعلق نہیں یہ ناک صرف ملک خضر حیات خاں ٹوانہ، سابق وزیر اعظم
 پنجاب کے چہرے پر ہے۔ سیاست کے اکھاڑے میں بہت بری طرح مکے اور
 گھونسے کھانے کے بعد آج کل یہ لندن میں اونچی ہونے کی کوشش کر رہی ہے
 لیکن پروفیسر نامسن اور مسٹر بکشن کی تحقیق کے مطابق سر و ملکوں میں ناک کے
 پینے کے کچھ زیادہ امکانات نہیں ہیں۔

برقیہ: یہ مضمون اشاعت کے لیے پریس میں جا رہا تھا کہ لندن سے ملک خضر
 حیات کا برقیہ موصول ہوا آپ لکھتے ہیں کہ مولانا چراغ حسن حسرت کی ناک کو ہر

گزر فراموش نہ کیا جائے کیوں کہ ایسی حسرت ناک وائبر کے بعد صرف انہی کے
دے میں آتی ہے۔

حسرت ان ناکوں پہ ہے جو بن گئے مرجھا گئیں

☆☆☆☆☆

کھانسی پر

ہمارے یہاں جب کوئی طبیب اپنا کام شروع کرتا ہے تو بسم اللہ کر کے وہ سب سے پہلے مردوں کی قوت مردی کے لیے نسخہ ایجاد کرتا ہے جس کو مجرب ثابت کرنے کے واسطے وہ خدا اور اس کے رسول کی قسمیں کھا کھا کر ساری عمر اشتہار دیتا رہتا ہے۔ یورپ میں جب کوئی فرم دوا سازی کا کام شروع کرے گی تو وہ سب سے پہلے کھانسی کی تیر بہدف دوائی ایجاد کرے گی اور باپ بیٹے اور روح القدس کو حاضر ناظر جانے بغیر اس کے حیرت انگیز اثر کا اشتہار دیتی رہے گی۔

کھانسی کے لیے اب تک جتنی انگریزی دوائیاں ایجاد ہوئی ہیں اور کسی بیماری کے لیے نہیں ہوئیں۔ سنا ہے کہ یہ مرض بہت پرانا ہے اور سب سے پہلے اماں حوا کو ہوا تھا۔ تحقیق و تدقیق کرنے والے اس نظریے کے جواز میں عورت کے ترشی پسند جبلی میاں کو پیش کرتے ہیں۔ حقیقت کچھ بھی ہو لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ عورتیں مردوں کی بہ نسبت کھٹی چیزیں زیادہ رغبت سے کھاتی ہیں۔ تجربے کے طور پر اگر آپ مردوں اور عورتوں کی ملی جلی محفل میں اپنی جیب سے اہلی کی پھلی نکالیں تو سب سے پہلے عورتوں کے منہ میں پانی بھر آئے گا۔

اس مرض کا آغاز عورت سے ہوا تھا یا مرد سے اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں کیونکہ یہ بیماری آج کل دنیا میں کافی مقبول ہے اور امرکان یہی ہے کہ آنے والی نسلوں میں اس کی مقبوضیت اربھی زیادہ بڑھ جائے گی۔ کھانسی سے شغف رکھنے والے ماہرین اعداد و شمار سے ثابت کر چکے ہیں کہ ہم پرانی نسل کے مقابلے میں

زیادہ کھانستے کھنگارتے ہیں اور یہ بات بھی پایہ تصدیق کو پہنچ چکی ہے کہ کھانسی صرف اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ اس کا علاج کیا جائے۔

کھانسی کے بے شمار علاج ہیں طبیعوں کے لبوب ہیں۔ قرص ہیں، شرب ہیں، معجونیں ہیں، دھونیاں ہیں، جو شاندرے ہیں، فقیروں اور درویشوں کی چمکیاں، آعوید اور ٹوٹے ٹوٹے ہیں۔ ایلو پیتھک اور ہومیو پیتھک کی ہزار ہادوائیں ہیں اور اگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والا معاملہ ہے تو پھانسی موجود ہے، نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

عرصہ ہوا ایک شخص نے جو پھانسی کے پھندے سے بچ کا تھا۔ اپنے تجربے کے پیش نظر نظریہ ضرب المثل ایجاد کی تھی کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ حال ہی میں ایک اور شخص نے پھانسی کے پھندے سے بچ کر پریس کانفرنس میں اپنا بیان دیا ہے کہ کھانسی پھانسی پر بھی آ جاتی ہے ثابت ہوا کہ یہ بات بری بلا ہے اس لیے خداوند کریم کو چاہیے کہ وہ سب کو اس سے محفوظ رکھے آمین ثم آمین۔

لیکن جو شخص اس مرض میں لاحق ہو جائے اس کو سب سے پہلے اس کے رنگ و نسل پر غور کرنا چاہیے۔ کیونکہ معلوم ہوا کہ اس کی ایک نہایت ہی ادنیٰ ذات جسے کالی کھانسی کہتے ہیں، بہت ہی خطرناک ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں گوری کھانسی کو لیجئے، بہت ہی بے ضرر قسم کی ہوتی ہے۔ جس طرح سفید فام انگریز، جس کو لاحق ہوتی ہے اسے زیادہ تکلیف نہیں دیتی۔ اس کا مریض ہولے ہولے کھانستا اور اسی طرح لگے بندھے سبتک کے اندر کھانستا کھانستا جاں بحق تسلیم ہو جاتا ہے اور لوگوں کو یہ کہنے کا موقع دیتا ہے۔

حق مغفرت کرے جب آزاد مرد تھا

اب کالی کھانسی کو لیجئے جسے حقارت کے طور پر کہتا کھانسی بھی کہتے ہیں۔ اس کا مریض دن کو تو خاموش رہتا ہے لیکن رات کو چونکہ دوسروں کو آرام کی نیند سونا ہوتا ہے، بھونکنا شروع کر دیتا ہے لیکن ہندوستانی اور پاکستانی گانگوں اور موسیقاروں نے بیک تان فیصلہ دیا ہے کہ کالی کھانسی اور رکتے کی عاف صوفی اعتبار سے کوئی مماثلت نہیں رکھتی۔ کالی کھانسی کھانسنے والا دوسرے کالے سے شروع کرتا ہے اور کتا چوتھے کالے سے کتوں نے فی الحال اس معاملے میں اپنی رائے کسی موزوں وقت کے لیے محفوظ رکھ چھوڑ ہے لیکن کانوں میں اتنی بھنک ضرور پڑی ہے کہ وہ اپنی بدترین قسم کی کھانسی کا نام انسانوں کی کھانسی رکھنے کا ریزولوشن پاس کرنے والے ہیں۔

انسان رنگ و نسل کی تمیز حرف غلط کی طرح منادینا چاہتا ہے لیکن اس کے جسمانی امراض میں رنگوں کی تمیز بدستور موجود ہے۔ کالا آزاد کو لیجئے، یرقان کو لیجئے۔ موثر الذکر کی بیماری بھی زرد رنگ ہونے کی وجہ سے گھٹیا قسم کی بیماریوں میں شمار ہوتی ہے۔ کالی کھانسی کا تو خیر کھانسیوں میں وہی درجہ ہوتا ہے جو ہندوؤں میں اچھوت کا ہوتا ہے۔ اسے کہتے تو چھوت کی بیماری ہیں لیکن اس سے سلوک وہی روا رکھا جاتا ہے جو اچھوتوں کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ چنانچہ کالی کھانسی کھانسنے والے انسانوں سے دوسرے رنگوں کی کھانسی کھانسنے والے بھی پرہیز کرتے ہیں اور ان سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کالی کھانسی چونکہ نیچ ذات ہے اس لیے عام طور پر اس کا حملہ کم سن بچوں پر ہوتا

ہے بے چارے مہینوں بستر پر مایہ آب کی طرح تر پتے رہتے ہیں۔ کھانسی کھانسی کر باکان ہو جاتے ہیں۔ غوطے پہ غوطے آتے ہیں، اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ جاتا ہے مگر یہ کم بخت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بچے اس کی تاب نہ لا کر ہمیشہ کی نیند سو جاتے ہیں۔ اگر بچہ کسی بڑے آدمی کا ہوتا ہے تو اخباروں میں مرض کے رنگ کی مناسبت سے سیاہ چوکھٹے کے اندر ”حادثہ جائیداد“ کے عنوان سے اس کی موت کا اعلان چھپ جاتا ہے اور یہ شعر لکھ دیا جاتا ہے۔

پھول تو دو دن بیمار جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے
کالی کھانسی کی ابتداء سنا ہے افریقہ کے ایک حبشی نے کی تھی مگر حبشی نہیں مانتے
اس لیے کہ یہ دریافت سفید نسل کے ایک آدمی سے منسوب ہے۔

کھانسی کی بے شمار قسمیں ہیں۔ وقت و وقت کی بات ہوتی ہے اسی طرح وقت و وقت کی کھانسی ہوتی ہے لیکن بے وقت کی کھانسی بہت ہی بے ڈھب مانی گئی ہے۔ سب آدمی سو رہے ہیں۔ چاروں طرف خاموشی ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ الماری کھول کر اس میں سے کچھ روپیہ یا چند زیور نکال لیں۔ آپ کا حلق آپ کی نیت کی طرح بالکل صاف ہے۔ خراش کا نام و نشان نہیں، پھیپھڑے بھی ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک ہیں، گرد و غبار کا بھی کوئی امکان نہیں لیکن دفعۃً آپ کے گتے میں گدگدی شروع ہو جائے گی۔ اُلاکھ دبانے کی کوشش کریں لیکن یہ بن بلانی کھانسی آ کے رہے گی۔

حلق اچھا بھلا صاف ہوگ۔ ان زخروں میں کسی قسم کی آلائش نہیں ہوگی لیکن جب آپ اقریر کرنے کے لیے انھیں گے معزز حضرات! کھوں کھوں۔۔۔۔۔ معزز حضرات۔۔۔۔۔ کھوں کھوں کھوں۔۔۔۔۔ معزز حضرات کھوں کھوں۔

ایسے اوقات میں ایلو پیٹھک، ہومیو پیٹھک اور یونانی طریقہ علاج کے تمام ماہرین نے متفقہ طور پر یہ نسخہ تجویز کیا ہے کہ اقریر کرنے والا اگر معزز حضرات کے آوازوں سے جانبر ہو جائے تو خودکشی کر لے۔

ایک کھانسی کا نظریہ یہ ہے کہ وقت نماز ہوتا ہے۔ محمود و ایاز صف باندھے کھڑے ہیں۔ دھیان اللہ کی طرف ہے۔ ایک دم کچھ ہوگا اور محمود کے حلق سے کھوں نکل جائے گی۔ ایاز جو کہ چوتھی صف میں آخری سرے پر سر بیٹھوڑے کھڑا ہے۔ اپنے حلق میں نیلی پیٹھی محسوس کرے گا اور غیر ارادی طور پر اس کے حلق سے بھی ایک عدد کھوں باہر سرک جائے گی۔ اس کا علاج لقمان حکیم کے پاس بھی چونکا نہیں تھا اس لیے ازاں خداوند حکیم کے پاس ہوگا۔

ایک کھانسی حقے کی کھانسی ہے۔ اس کو کھانسنے والے حضرات منہ اندھیرے اٹھ کر خدا کا نام لیتے ہیں نہ رسول کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ سب سے پہلے اپنا حقہ تازہ کرتے ہیں اور چلم بھروا کر اوپس کش لیتے ہیں کھانسنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کھانستے کھانستے منہ سرخ ہو جائے گا، گٹے کی رگیں ابھر آئیں گی، چھاتی دھوئنی کی طرح جلنے لگے گی مگر وہ حقے کے بقعہ کھینچتے جائیں گے۔ ان حضرات کا بیان ہے کہ آدمی جتنا زیادہ کھانسنے اتنا ہی زیادہ ثواب ہوتا ہے۔

حقہ کھانسی کھانسنے والے جب بڑھے ہو جاتے ہیں تو ایک ہی کش ان پر چودہ طبق روشن کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے چنانچہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ پہلا کش لے کر یہ بزرگ ایک دفعہ کھوں کھوں کرتے ہی مراقبے میں چلے جاتے ہیں اور تقریباً ایک گھنٹے تک اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رکھنے کے بعد دوسری کھوں کرنے کے لیے ہوش میں آتے ہیں۔

کھانسی برائے کھانسی ہے یا کھانسی برائے زندگی ہے۔ اس پر ایک زمانہ سے بحث ہو رہی ہے۔ دو سکول بن گئے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ انسان کو صرف کھانسنے ہی کے لیے کھانسا چاہیے۔ دوسرا کہتا ہے نہیں انسان کو اپنی زندگی کے لیے کھانسا کھنکارنا چاہیے۔ موخر الذکر کر سکول کے پیرو چنانچہ بسا اوقات لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے کھانسی ہی سے کام لیتے ہیں۔ دوست جا رہا ہے، حلق سے جموڑی سی خرخر اہٹ پیدا کی ”کھوں کھوں کہیے جناب کیا حال ہے؟“

پاخانے میں محو اجابت دروازی میں کنڈی نہیں ذرا آہٹ ہوئی تو کھانس دیا مطلب یہ کہ نوویکمنسی!

دور کوٹھے پر کھڑی ایک عورت اپنے بال سکھا رہی ہے پیٹھ آپ کی طرف ہے جی چاہتا ہے کہ اس کی شکل دیکھی جائے گئے میں ذرا سر سر اہٹ پیدا کی اور تیکھی سی کھوں ہواں میں چینگ دی۔ یوں چنگی بجاتے میں مطلب حل ہو جاتا ہے۔

آپ کے دوست کے ساتھ ایک عورت جا رہی ہے۔ معلوم نہیں اس کی بہن یا ماں۔ لیکن چونکہ آپ کو اس پر جتنا ہے کہ وہ ایک عورت کے ساتھ جانے کی عیاشی کا مرتکب ہو رہا ہے اس لیے آپ بلا تکلف ایک یا دو مرتبہ کھوں کر کے اپنا فرض

منجہنی ادا کر سکتے ہیں۔

ایک کھانسی خلاصہ گوئیوں کی کھانسی ہے جیسے فیشن کے طور پر استعمال کی جاتی ہے محفل جمی ہوئی ہے آپ ہارمونیم کی پیٹی اپنے گانے والے دوست کی طرف بڑھاتے ہیں اور کچھ سنانے کی فرمائش کرتے ہیں وہ ضرور اپنا ہاتھ گئے کی طرف لے جائے گا اور اسے دبا کر آپ سے کہے گا ”مجھے کئی دنوں سے کھانسی کی شکایت ہے کھوں کھوں دیکھ لیا۔“

سنا ہے کہ میاں تان تین اور بیجو باورے نے اپنے شاگردوں کو ہدایت کی تھی کہ فرمائش پر فوراً ہی گانا شروع کر دینا ہا کا پن ہے اس لیے کھانسی اور زکام کی شکایت کا بیان کرنا لازم ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر سر غلط ہو جائے تو فوراً کھانسی کو محرم قرار دیا جاسکتا ہے۔

عادت پک کر طبیعت بن جاتی ہے چنانچہ گانے والے جب ریاض بھی شروع کرتے ہیں تو استاد کا نام لے کر ایک دو بار کھانسی کھنکار لیتے ہیں۔

بعض اوقات کچھ کھاتے یا پیتے ہوئے ایک دم ایسی کھانسی اٹھتی ہے کہ اتمہ اور گھونٹ پھوں کر کے ناک، کان اور منہ کے رستے باہر نکل آتے ہیں اور پھر کچھ اس قسم کی کھوں کھاں شروع ہوتی ہے کہ آدمی سمجھتا ہے بس کام تمام ہوا لیکن دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر کام تمام نہیں ہوتا۔ خاص طور پر کیا ہوتا ہے اس کے متعلق خواص عوام سے بہتر جانتے ہیں۔ کھانسی کے اس ناگہانی حملے کو اردو نے ”معلیٰ میں“ ”اچھو“ کہتے ہیں۔

کھانسنے کھنکارنے اور اس عمل سے بلوئے ہوئے باقم کے ذریعے سے فرشوں

اور دیواروں پر پلستر کرنے اور تیل بولے بنانے کی صفت کسی زمانے میں ہمارے
یہاں معراج پر تھی لیکن انگریزوں کی ایک سو سالہ حکومت میں اس سے اچھا سلوک
نہ ہوا۔ پر اب کہ القعدا قریب انیاں دینے کے بعد خدا کے فضل و کرم سے دنیا کی سب
سے بڑی اسلامی سلطنت قائم ہو چکی ہے۔ ہمیں اس صحت مند صفت کو بام رفعت
تک پہنچانے کے لیے مقدور بھر کوشش کرنی چاہیے۔



سوال پیدا ہوتا ہے

معزز خواتین اور معزز حضرات ذلیل عورتوں اور ذلیل مردوں، باادب با ملاحظہ ہوشیار!!۔۔۔ آپ سب کو بروقت آگاہ کیا جاتا ہے کہ ایک سوال پیدا ہو رہا ہے۔ دیوٹ آدم سے لے کر اب تک اتنے ہی سوال پیدا ہو چکے ہیں جتنے آسمان میں تارے ہیں لیکن پھر بھی آئے دن پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کوئی اٹھ کر یا بیٹھ کر یہ نہیں کہتا کہ اب مزید سوال پیدا نہیں ہونے چاہئیں۔

آبادی گھٹانے کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ بھونچال پیدا کرتا ہے، لڑائیاں پیدا کرتا ہے، قحط پیدا کرتا ہے، پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان پیدا کرتا ہے، برتھ کنٹرول کے نئے طریقے انسانوں کو سمجھاتا ہے مگر وہ سوالوں کی جمع در جمع اور ضرب در ضرب کی طرف توجہ نہیں دیتا۔

سوال ہر جگہ پیدا ہوتا ہے اور ہر مقام پر پیدا ہو سکتا ہے اس کے لیے خاص موسم کی، خاص مٹی کی، خاص پانی کی، کھاد کی، ہل کی، ٹریکٹر کی، کوئی ضرورت نہیں، بچہ نومینے کے بعد پیدا ہوتا ہے لیکن سوال نطفہ قرار پاتے ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ اسے دایہ گیری کی حاجت نہیں میسٹری ہوم کی ضرورت نہیں کلورافارم درکار نہیں آؤڈ یوگتا ہے نہ تاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

عدالت میں مجسٹریٹ حقہ پنی رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ چرکیں کا دیوان مطالعہ کر رہے ہیں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا مجرم پیش ہوتا ہے وہ مجسٹریٹ صاحب کو ساما نہیں کرتا فوراً تو بین عدالت کا سوال پیدا ہو جائے گا۔

ہے؟۔۔۔۔۔ اگر مصلحت خاموشی میں ہے تو جو آدمی ذہین ہیں اور جنہیں عرف عام میں سیاست دان کہا جاتا ہے، یقیناً خاموشی ہی اختیار کریں گے مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ خاموشی دوسروں کے ذہن میں تکلم کی صورت اختیار نہیں کرے گی؟۔۔۔۔۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان آدمیوں کا خاتمہ ہی کیوں نہ کر دیا جائے، جن کے زرخیز دماغوں میں سیاست دانوں کی خاموشی تکلم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔۔۔ مگر ایک سوال پھر پیدا ہو جائے گا کہ ایسے آدمیوں کا خاتمہ جسے انگریزی کے عرف عام میں ”پرچ“ یعنی جلاب، کہا جاتا ہے کیا دوسرے لوگوں کے اذہان پر بھی قابض ہو جائے گا اور ان میں اس جلاب کا کوئی بھی رد عمل پیدا نہیں ہونے دے گا۔

ایک انسان یا ایک جماعت، ایک قوم پر بہت سی قوموں پر حکومت کرتی ہے، سمجھ میں نہیں آتا۔ محکموں کے دماغ میں سوال کیوں پیدا ہو جاتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ بس اس فرد واحد یا اس جماعت کا جی چاہتا ہے کہ حکومت کرے اور حکومت کے کرنے کے لیے قواعد و ضوابط بھی کون سے مقرر ہیں۔ پھر ان لوگوں کے دماغ میں جن پر ان کی بہتری کے لیے حکومت کی جاتی ہے، ایسے سوال کیوں پیدا ہوتے ہیں جن سے ان کی سوومندی غلامی میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

فرانسیسی مفکر جے جے روسو کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ انسان جب آزاد پیدا ہوا ہے تو اسے کیوں زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔۔۔ لیکن اس سوال کا حشر کیا ہوا؟ زنجیریں کاٹنے کاٹنے کئی انسان کٹ گئے۔۔۔۔۔ سوال پیدا ہوتا

ہے کہ آیا ایسا انقلاب جائز ہے؟ روس میں کیا ہوا؟۔۔۔۔۔ صدیوں کے غلام آزادی کا سوال لے کر اٹھے اور نتیجہ کیا ہوا۔۔۔۔۔ ان کے مطلق العنان بادشاہ زار کو ایک عرصے تک سائبیریا کی تین بستہ فضاؤں میں مزدوروں کا سا کام کرنا پڑا۔۔۔۔۔ آخر میں انقلابیوں نے خدا کے اس سائے کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔ زار کی یہ حالت دیکھ کر شاید ہی کوئی ایسا بادشاہ ہو جس کی آنکھوں میں آنسو نہ آ جائیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ رعایا کو کیا حق ہے کہ وہ اپنے بادشاہ سامت کو عالم پناہ کو محض ایک چھوٹا سا سوال پیدا ہونے پر قربان کر دے لیکن کیا کیا جائے۔ سوال چھوٹے ہوں یا بڑے، موٹے ہوں یا پتلے، پیدا ہو ہی جاتے ہیں، بے سوچے سمجھے، انجام کا خیال کئے بغیر، تعزیر سے بے پرواہ، بس پیدا ہو جاتے ہیں۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ جو سوال دماغ میں پیدا ہوتے ہیں، ان کی کاٹ دماغ ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ سوال جو پیٹ کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی کاٹ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کے پیٹ میں بھوک کا سوال پیدا ہوتا ہے، اگر اس کے جواب میں آپ ہمدردی کا اظہار کریں، آنے والے مسرت بھرے دور کا وعدہ کریں جنت کی جھلک دکھائیں، جہاں انگور کے دانے اپنے آپ جھک کر منہ میں اپنا رس چوایا کریں گے تو ظاہر ہے آپ کی سعی بار آور ثابت نہیں ہوگی کیوں کہ پیٹ کا سوال فوری جواب مانگتا ہے۔ اسے روٹی کی ضرورت ہے۔۔۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے پھر کیوں پیٹ کے سوال کا حل روٹی کی بجائے سوٹی سے کیا جاتا

4 کیا عورت کا زمین پر زور سے پاؤں مار کر چلنا جائز ہے؟

5 عورت کا شلوار پہن کر گھر سوار کرنی چاہیے یا ساڑھی پہن کر؟

عورت جی کے سلسلے میں ایک اور سوال پیدا ہوا تھا۔۔۔۔۔ جب ایک
داڑھی والی عورت نے ایک مولوی سے پوچھا تھا میرے متعلق کیا احکام ہیں کیا
مجھے داڑھی رکھنی چاہیے اگر جواب اثبات میں ہے تو فرمایا جائے کتنی
لبی۔۔۔۔۔ اور مونچھوں کے متعلق کیا حکم ہے لیس کتروانی چاہئیں یا نہیں؟

ایک سوال جو بار بار پیدا ہو کر ہمارے قارئین کو ستا رہا ہے ان پچاس ہزار
عورتوں کا ہے جو اس پار رہ گئی ہیں اور دوسروں کے استعمال میں آ رہی ہیں۔ نو مہینے
سے کچھ اوپر ہو چکے ہیں، انہیں اس کا حل سوچتے ہوئے اور اب مصیبت یہ ہے کہ
ان پچاس ہزار عورتوں کے سوال کے ساتھ ہی پچاس ہزار اور چھوٹے چھوٹے
سوال پیدا ہو جائیں گے اور بہت ممکن ہے دس بیس ہزار ہو بھی چکے
ہوں۔۔۔۔۔ اعنت بھیجئے ان پر۔۔۔۔۔ یہاں ایک اور سوال پیدا ہو رہا تھا۔

معزز خواتین و حضرات، ذیل عوتو، ذیل مردو۔۔۔۔۔ جو سوال پیدا ہو
رہا تھا، پیدا ہوتے ہی مر گیا۔۔۔۔۔ سوال مر
گیا۔۔۔۔۔ سوال زندہ باد۔۔۔۔۔!!

☆☆☆☆☆

کچھ ناموں کے بارے میں

بچہ پیدا ہونے سے پہلے یہ استنساخ کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ وہ کس پر گیا ہے۔ تہیال پر یا دھویال پر اس کے خدو خال چھیرے ہیں، میسرے ہیں یا خلیرے۔ کوئی ناک بالکل باپ کی بتائے گا اور کوئی ہو بہو ماں کی اور کوئی اسے خالہ کے بھائی کے باپ کے چچا کے دادا کی ناک سے جاملانے گا۔

بعض اوقات ایسا منفرد بچہ بھی پیدا ہوتا ہے جس کے ناک نقشے کا سراغ اس کے آباؤ اجداد کے شجرہ سرا میں ڈھونڈنے پر بھی کہیں نہیں ملتا۔ لیکن بوڑھی عورتیں بھی کچھ ایسی کو لمبس ہوتی ہیں کہ وہ یہ امریکہ بھی دریافت کر لیتی ہیں اور اس منفرد بچے کے ماں باپ کی الجھن دور کر دیتی ہیں۔

بچہ تو خیر مگر وقت کے بعد پیدا ہونا ہی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ناک نقشہ ملانے کے علاوہ اس کی پیدائش پر اور بھی کئی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہم یہاں ان تمام پیچیدہ مسائل کا ذکر نہیں کریں گے اس لیے کہ بچے کا نام رکھنے کا کیا مسئلہ ہی اس صحبت کے لیے کافی ہے۔

بچہ یا بچی جو بھی آپ کی قسمت میں تھی، پیدا ہو گئی۔ اس کا ناک نقشہ بھی کھینچ گھسیٹ کر کسی سے مل گیا لیکن ابھی چھٹی نہیں ہوئی اس لیے کہ اس دنیا میں نئے نئے والے یا نئی نئی آنے والی کا نام کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیے۔ اگر آپ ڈکٹیٹر قسم کے انسان ہیں اور اپنے عزیز واقارب کے جذبات و احساسات کو بالکل خاطر میں لانے والے نہیں تو آپ اپنے تخلیق کردہ گوشت پوست کے اوتھرے کا

دارے کے لیے منتخب کر لیں آدمی کس کی سنے اور کس کی نہ سنے۔ کس کا کہنا مانے، کس کا نہ مانے کس کا دل رکھے اور کس کا واپس کر دے۔۔۔۔۔ ناموں کی فہرستوں پر غور کرتا رہے اور بچوں کے عزیزوں کے جذبات و احساسات کو بھی پیش نظر رکھے تو بہت ممکن ہے بچہ بوڑھا ہو کر اپنے والدین کے نام پر نظر ثانی شروع کر دے۔۔۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر والدین گھبرا کر جلدی میں اپنے لخت جگر کا نام مقرر کر دیتے ہیں۔

اولاد کا نام مقرر کرنے میں بعض اوقات اس گھبراہٹ، غلت اور الجھن کے علاوہ تو ہم پرستی کا دخل بھی ہوتا ہے۔ اگر لڑکایا لڑکا بہت دیر کے بعد اور بڑی منتیں ماننے کے بعد پیدا ہوا ہے تو اس کا نام بھی اسی مناسبت سے رکھا جائے گا لڑکا ہے تو مثال کے طور پر اللہ دتہ، پیراں دتہ، خدا بخش، نبی بخش، لڑکی ہے تو اللہ رکھی، پیراں دتی، خیراتن، حیاتن وغیرہ اور اگر بہت سے بچے مرنے کے بعد خدا نے لڑکایا لڑکی دی ہے تو نام کچھ یوں ہوگا۔ اللہ جوایا، رلدو، گھسیٹا، کلن، کلو، کلب علی وغیرہ۔

انگریزی کی ایک ضرب المثل ہے کتے کو کوئی برا نام دو اور اسے پھانسی پر لٹکا دو۔ لیکن چونکہ بچے کو پھانسی دینا مطلوب نہیں ہوتا۔ لہذا اس کے واسطے اچھے سے اچھا نام چننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں والدین کافی دوڑ دوپ کرتے ہیں۔ قرآن سے فالیں نکالی جاتی ہیں۔ زائچے تیار کرائے جاتے ہیں، نجومیوں اور جناروں سے رجوع کیا جاتا ہے۔ پیروں اور فقیروں کی رائے طلب کی جاتی ہے پھر جا کر بچے یا بچی کے لیے مناسب و موزوں نام ملتا ہے لیکن اولاد جو نہیں سن شعور کو پہنچتی ہے اپنے نام کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ والدین کے

جذبات و احساسات بالائے طاق رکھ دینے جاتے ہیں اور اپنے نام سے بددلی اور بے اطمینانی پیدا ہو جاتی ہے۔

ہونا یہ چاہیے تھا کہ سن شعور کو پہنچنے تک اولاد باطل بنام رہے۔ جوں ہی لڑکا یا لڑکی شعریا افسانہ لکھنے کے قابل ہو جائے اس سے کہہ دیا جائے، اب تم جو چاہو اپنا نام رکھ لو۔ ایسا کرنے سے نہ تو والدین کا دل دکھے گا اور نہ اولاد ہی کو شکایت کا موقع ملے گا۔

مشہور ترقی پسند شاعر نذ محمد کا نام اگر ان کی طبیعت اور مزاج کے مطابق ہوتا تو ظاہر ہے کہ انہیں اس میں قطع و برید کی ضرورت کبھی لاحق نہ ہوتی۔ اگر وہ نذ محمد ہی پر طوعاً و کرہاً قانع رہتے تو آج اردو ادب یقیناً نام راشد کی ترقی پسند شاعری سے محروم رہتا۔ شروع شروع میں یعنی قطع و برید کے فوراً بعد کچھ عرصے تک انہیں اپنے نام سے کچھ اجنبیت اور غیریت ضرور محسوس ہوتی ہوگی مگ اب وہ کچھ اس کے ایسے نادبی ہو گئے ہیں کہ اگر کوئی انہیں نذ محمد کے نام سے پکارے تو وہ سمجھیں گے کسی اور آدمی کو بلایا جا رہا ہے۔

ایک اور شاعر ہیں ماں باپ کا رکھا ہوا نام فضل دین ہے مگر اس زمانے میں جب کہ دین اور اس کے فضل کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ یہ نام کتنا بوسیدہ معلوم ہوتا ہے فضل دین کو اس کا شدید احساس ہوا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً اس پرانے نام کو انجم رومانی ایسے رومانٹک نام میں تبدیل کر دیا۔ سینے کا یہ بوجھ ہلکا ہوتے ہی آپ نے شاعری شروع کر دی جو بڑے بلکی چٹکی ہے، اگر وہ اپنا نام فضل دین ہی رہنے دیتے تو ناقدین ادب یقیناً ان کے کلام کو پرانی شاعری کے منکے میں پھینک

دیتے۔

وقارا نابالوی صاحب نے پہلے اپنا نام غاطف مولاناوی رکھا چنانچہ اس نام سے ”ہمایوں“ میں ان کے اکثر مضامین چھپتے رہے لیکن جب انہوں نے غاطف مولاناوی کے سامنے اپنا اصلی نام کاظم علی رکھ کر دیکھا تو یہ تبدیلی انہیں باوقار معلوم نہیں ہوئی چنانچہ انہوں نے دوسرا چولا بدلا اور وقارا نابالوی ہو گئے۔

ابوالکلام آزاد پہلے معین احمد تھے۔ ساغر نظامی، صدیا رخاں۔ ان کے استاد سیما، عاشق حسین۔ حضرت جوش، شبیر حسن خان، جگر مراد آبادی، علی سکندر، سید جالب، بشارت علی اور نوح ماروی بندے حسن۔

قتیل شنائی کے ساتھ ان کے والدین نے یقیناً ظلم کیا تھا جو اورنگ زیب نام رکھ دیا۔ کہاں ترقی پسند شاعری اور کہاں رجعت پسند اورنگ زیب۔ میراجی کے نام سے کون واقف نہیں۔ آپ بھی شاعر ہیں اور ایسے ترقی پسند شاعر ہیں کہ ان کا بیشتر کلام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر رہتا ہے۔ آپ کا اصلی نام ثناء اللہ تھا۔ جس کا مطلب واضح ہے اگر آپ ثناء اللہ ہی رہتے تو آپ کو مجبوراً ایسے اشعار کہنے پڑتے جن کا مطلب واضح ہوتا لیکن ثناء اللہ کی زندگی کا مقصد چونکہ یہ نہیں تھا اور وہ پر اسرار قسم کی شاعری کرنا چاہتے تھے اس لیے انہیں اپنا نام بھی کچھ اسی قسم کا رکھنا پڑا۔ مرزا ادیب بی اے آنرز شاعر تو نہیں لیکن شاعرانہ طبیعت رکھنے والے افسانہ نویس ضرور ہیں۔ آپ کا اصلی نام دلاور علی ہے۔ نہ تو آپ دلاور ہیں اور نہ دل بدست آور چنانچہ جو نہیں آپ کو اپنے نام اور اپنے کردار میں بعد محسوس ہوا۔ آپ ارتقاء کی تمام منزلیں ایک ہی جست میں طے کر کے مرزا ادیب بی اے آنرز بن

گئے۔

اردو ڈرامہ نگاری کے دو نقاد بہت مشہور ہیں جن کا نام ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ چپکا رہتا ہے۔ ہماری مراد محمد عمر نور الہی صاحبان سے ہے۔ شوکت تھانوی صاحب کا اصلی نام محمد عمر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ تھانے میں جب شوکت صاحب نے ظرافت نگاری شروع کی ہوگی تو اس لیے کہ انہیں بھی اپنے لیے ایک نور الہی پیدا کرنا پڑے گا خوف الہی کھا کر اپنا نام تبدیل کر لیا واللہ اعلم بالصواب۔ ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر میں کافی رعب ہے لیکن اصلیت کی طرف جائیں تو صرف محمد وین رہ جاتا ہے جس کے ساتھ ڈو کٹر ٹیٹ انمک بے جوڑی لگتی ہے۔ احمد شاہ بخاری، اے بخاری بی کی شکل میں بھلے گتے ہیں۔

ان کی مزاح نویسی پر احمد شاہ باکل چسپاں نہ ہوا کیونکہ لوگوں کا خیال احمد شاہ ابدالی کی طرف چلا جاتا جسے مزاح اور ظرافت کی بجائے لوٹ مار سے دلچسپی تھی۔ بہزاد لکھنوی کی اصلیت نور محمد ہے۔ یوں تو ان کی بھوی داڑھی اور چوڑی پیشانی سے کافی نور برستا ہے لیکن ریلوے کی ملازمت کے دوران میں جب آپ کو محسوس ہوا کہ ان کی جہات کو نور سے زیادہ رنگوں سے نسبت ہے تو آپ نور اکایا کلپ کرا کے بہزاد لکھنوی بن گئے اور بڑے سکون اور اطمینان سے شاعری شروع کر دی خضر تہمی صاحب اگر موالا بخش ہی رہتے تو ظاہر ہے دنیائے ادب میں ان کی وہی حیثیت ہوتی جو سکولوں میں استاد کے ڈنڈے کی ہوتی ہے۔

فلموں کے مشہور گیت لکھنے والے ڈی این مدھوک صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک بے نیاز انسان ہیں لیکن ان کو بھی اپنا اصلی نام جو کہ دینا نا تھ

ہے، پسند نہ آیا اور اسے ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی طرح فرنگی رنگ میں رنگ دیا۔
 فلموں کا ذکر آیا تو لگے ہاتھوں ناموں کی شدھی کا بھی ذکر خیر و شر ہو جائے
 پورن بھگت بن رہا تھا۔ دیو کی بوس نے پورن کے رول کے لیے لکھنؤ کے ایک مسلم
 نوجوان علی میر عرف جسن کو منتخب کیا لیکن سوال پیدا ہوا کہ ہندو قوم معترض ہوگی۔
 اتنے بڑے بھگت کا روپ ایک مسلمان نے دھارن کیا ہے۔ چنانچہ اس سوال کے
 پیش نظر علی میر کے نام کی شدھی کر دی گئی اور وہ اس فلم میں مار کے نام سے پیش
 ہوا۔

اس کے بعد مسلمان ایٹروں اور ایٹرسوں کو ہندوانہ نام دے کر پیش کرنے
 کا ایک فیشن بن گیا۔ ذکر یا خان جو ٹھیٹ پٹھان ہے جینت ہو گیا اور یوسف،
 دلپ، مار کشمیری نذر کی شدھی ہوئی اور وہ ”امر“ ہو گیا۔

اب ایٹرسوں کو لیجئے تا جور (تا جور نجیب آبادی صاحبسے اس تا جور کا کوئی
 تعلق نہیں) ویٹا بن کر فلموں میں گونجنے لگی اور شاہدہ کو جب فلموں میں مشہور کیا گیا
 تو اس کا نام نینا تھا۔

دو غلام بھی رکھے گئے جن سے ہندو مسلم اتحاد کی بو آئے۔ مثال کے طور پر
 ممتاز شانتی، گیتا نظامی وغیرہ وغیرہ، ایک ایٹریس کا نام ہے آشنا پوسلے، سمجھا
 کرے کوئی، ناموں کے معاملے میں کچھ حضرات دوسروں کے مقابلے میں بہت
 ثابت قدم واقع ہوئے ہیں۔ سردار کھڑک سنگھ اتنے برس گزر گئے ہیں انہیں
 کھڑکتے ہوئے لیکن مر رہا ہے کہ ابھی تک ان کے دل میں کھڑکھڑاتا نام تبدیل
 ہونے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔

تقسیم ہندوستان سے پہلے لاہور میں ایک ودھوا سنگھ تھے آپ کو اس بیڈھب نام سے بالکل نفرت پیدا نہ ہوئی اور جب تک یہاں دکان رہی، برابر ”بھائی ودھوا سنگھ کے اچار شائع“ کا اشتہار دیتے رہے۔

سکھوں میں کئی لاہور سنگھ ہیں، پشاور سنگھ ہیں، پہاڑ سنگھ ہیں، ہتھوڑ سنگھ ہیں، ہمارا خیال ہے ان میں سے اگر کوئی ترقی پسند شاعر ہی کیوں نہ بن جائے تو بھی وہ اپنا نام تبدیل نہیں کرے گا۔

مر جائے تے بھائیں جائے میری سکھی صدق نہ جائے سکھوں کی جرات رندانہ کی داد دینی پڑتی ہے ورنہ ایمان کی بات ہے کون پہاڑ سنگھ جیسے بھاری بھر کم نام کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکتا ہے۔

ہلکے پھلکے اور خوبصورت نام رکھنے میں گانے اور مجرا کرنے والیاں پیش پیش ہیں، شمشاد ہے، صنوبر ہے، گلاب ہے، نیلم ہے، الماس ہے، انوری ہے، مشتری ہے، زہرہ ہے اور یہ نام کچھ اس طرح اس خاص طبقے سے منسوب کئے ہوئے ہیں کہ دوسروں کے لیے شجر ممنوعہ بن گئے ہیں۔

گانے والیوں میں بیو ابائی، چھوٹی موٹی بانی اور طمنچہ جان ایسے عجیب و غریب نام بھی موجود ہیں آخر الذکر کو ترقی پسندی کی آخری حد تک جا پہنچا ہے مگر صلائے عام ہے یاران نکتہ واں کے لیے۔۔۔۔۔ آج کل دوسری اجناس کی طرح ناموں کا بھی قحط ہے۔ نئے نام تلاش بسیار کے بعد بھی دستیاب نہیں ہوتے۔ ہمارا خیال ہے طمنچہ جان نے نئے ناموں کا ایک بالکل ہی نیارستہ کھول دیا ہے۔ بڑی آسانی سے ایسے مسلح نام وضع کئے جاسکتے ہیں۔

توپ ماری، اینٹی ایر کرافٹ نیگم، ایٹم الدین، ٹینک سگھ، بندوق بانو، گولہ
بخش، مشین گن داس، بل ڈوزر خان، سنگین خاتون، مائن کور، تھری نوٹ تھری چند،
ہینڈ گریپڈ دیوی، مورٹر مل، بوہر بانی، دی ون جان، دی ٹوبوس وغیرہ وغیرہ۔

☆☆☆☆☆

میں فلم کیوں نہیں دیکھتا

بہت دنوں سے میری خوانش تھی۔ کوئی مجھ سے سوال کرے کہ میں فلم کیوں نہیں دیکھتا۔ گھر میں کئی دفعہ مجھ سے پوچھا گیا کہ ”میں بھنڈی کیوں نہیں کھاتا“ یار دوستوں نے متعدد بار دریافت کیا ”میں پتلون کیوں نہیں پہنتا“ گھر اور گھر کے باہر یہ استفسار بھی کئی مرتبہ ہوا کہ ”میں بال کیوں نہیں کھاتا“ پر مجھ سے میری خوانش کے مطابق یہ کسی نے پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ”میں فلم کیوں نہیں دیکھتا؟“۔۔۔ حالانکہ مجھے جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ فلم ایک زمانہ ہوا، مجھے بے حد مرغوب تھے۔ ایک ایک دن میں تین تین فلم دیکھتا اور جو پسند آ جائے اسے بار بار دیکھتا تھا۔ امرتسر سے لاہور اور جالندھر جا جا کے دیکھتا تھا اور مجھے یاد ہے ایک فلم کے لیے جس میں میری پسندیدہ ہیروئن کام کر رہی تھی۔ مجھے دہلی تک کا سفر اختیار کرنا پڑا لیکن ایسا کیا ہوا جو میں نے فلم دیکھنے بند کر دیئے۔

بہت دنوں کے بعد یہ مجھے آج موقع ملا کہ اپنے دل کا بوجھ ہاکا کر دوں ورنہ جب بھی فلم دیکھنے کی دعوت پر میں نے کسی دوست سے کہا ”میں فلم نہیں دیکھا کرتا“ اور متوقع رہا کہ وہ مجھ سے پوچھے گا، آخر کیوں؟ مجھے ہمیشہ ناامیدی ہونی کسی نے کھٹ سے موٹر کا دروازہ بند کیا اور اچھا کہہ کر یہ جاوہ جا۔ کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی اور میں نے بجائے ”آخر کیوں؟“ کے یہ سنا ”تم عجیب و غریب آدمی ہو“ اور کسی نے بالکل بیویوں کی طرح کہا ”اچھا ہے، میرے پیسے بچ گئے۔“

کوئی زمانہ تھا کہ ایڈی پولو سے لے جون گلبرٹ اور میری پکفورڈ سے لے کر گلوریاسنسن تک مجھے تمام ایٹریاٹرسوں کے نام، ان کے پتے اور ان کی عمریں یاد تھیں۔ لکین گش اور اس کی بہن ڈورتنی کش کے قد کی لمبائی تو مجھے ابھیت ک یاد ہے لیکن آج مجھ سے کوئی پال روسن کی بات کرے تو میرا دھیان روسن کرو سو کی طرف چلا جاتا ہے اور جگر کا ذائقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ میرے دوست احباب شاننا وین، شاننا ہلی کر اور شاننا موزدار کی کردار نگاری پر بحث شروع کرتے ہیں تو میں چلا دیتا ہوں ”شافتی! شافتی!“ پری چہرہ نسیم بانو، حور تمثال وینا، آہو چشم رائی، کافر اڈریا اور مرمریں جسم شمیم سے اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں آپ سوچیں گے شاید میں دنیا تیاگ کے سنیا سی بن گیا ہوں، بدن پر بھبھوت مل کے میں نے کسی پہاڑ کی چوٹی پر آسن جمایا ہے۔۔۔۔۔ جی نہیں، میں ابھی تک آپ ہی کی دنیائے رنگ و بو میں سانس لے رہا ہوں کل کا بھروسہ نہیں۔ ابھی تک کھاتا ہوں، پیتا ہوں، سوتا ہوں، جاگتا ہوں، اچھے افسانے پڑھ کر داد دیتا ہوں، موزوں شعر سن کر پھرخ بھی جاتا ہوں لیکن صاحب میں فلم نہیں دیکھتا۔

کوئی زمانہ تھا، میرے کمرے کی زینت صرف ایٹریا اور ایٹریسوں کی تصویریں ہوا کرتی تھیں۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ ان تصویروں کے فریم میں خود اپنے ہاتھ سے بنایا کرتا تھا لیکن آج میرے کمرے میں آپ کو صرف ڈاسن کے کارٹون آویزاں نظر آئیں گے جو بندوں کے نفسیات کی تصویر کشی کا ماہر ہے۔۔۔۔۔ آپ سوچئے اتنا بڑا انتخاب کیسے برپا ہوا؟

میرے دل و دماغ میں بہت ہی خوبصورت صنم خانہ تھا جس میں ہر شام اپنے

پسندیدہ ایٹروں کی آرتی اتارنے میں مجھے روحانی مسرت حاصل ہوتی تھی مگر ایسا کیا ہوا جو میں نے عقیدت کے سب چراغ بجھا دیئے۔ سارے پھول پاؤں تلے روند ڈالے۔۔۔ کیا مجھ میں غزنوی کی روح حلاو کر گئی تھی؟۔۔۔۔۔ جی نہیں، میری داستان بالکل مختلف ہے بعض لوگ فلم اس لیے نہیں دیکھتے کہ آشوب چشم میں مبتلا ہیں، بعض اس لیے کہ فلم شروع ہوتے ہی ہال میں سو جاتے ہیں، کچھ اس لیے کہ رقیق القلب ہیں، پردے پر مکالمہ کلام عشق لڑتا دیکھ کر ان پر دل کے دورے پڑے لگتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو شیطانی کمیل سمجھ کر ان سے دور رہتے ہیں لیکن میں کیوں ان سے احتراز کرتا ہوں۔۔۔۔۔ میری بینائی کمزور ہے لیکن چشمہ اس کی تلافی کے لیے میری ناک پر ہر وقت موجود رہتا ہے میرا دل چشم بدور کافی مضبوط ہے۔ ثبوت کے لیے ڈاکٹر کا لیا ہوا کارڈیوگرام موجود ہے۔ میں فلموں کو انسانوں کا کمیل سمجھتا ہوں پھر وجہ کیا ہے کہ فلم نہیں دیکھتا۔

میں فلم نہیں دیکھتے ایسے سن کر ان لوگوں کو تو اور بھی زیادہ حیرت ہوگی۔ جو مجھے فلم نویس کی حیثیت سے جانتے ہیں سوچتے ہوں گے یہ کیسا شخص ہے، فلم کے لیے کہا: بیاں لکھتا ہے، مکالمے لکھتا ہے، ایک فلم میں قریب قریب ایکٹ بھی کر چکا ہے، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو لگ بھگ دس برس سے اس صنعت میں جھک مار رہا ہے اور کہتا ہے میں فلم نہیں دیکھتا۔۔۔۔۔ صریحاً بن رہا ہے۔

صاحب حاشا وکلاء میں بن نہیں رہا، روز محشر میرا گریبان کسی بھی ایڈٹریس کے ہاتھ میں ہو جو میں آپ کے سامنے بناوٹ سے کام لوں۔۔۔۔۔ ایجنے میں آپ سے چجوچج عرض کرتا ہوں۔۔۔۔۔ بناوٹ اور صرف بناوٹ نے میرا دل کھٹا

اور ایک پارسک سوپ سگریٹ ۔۔۔۔۔ یہ میں سب ابھی حاضری کئے دیتا ہوں،

لیکن یہ ”فرض ادا“ کی ترکیب بالکل غلط ہے۔“

سیٹھ صاحب نے غصے سے پوچھا ”کیا بولا؟“

میں بولا ”میں یہ بولا کہ جو کچھ آپ بولے ہیں، ہماری بولی میں چلنے کو نہیں

سکے گا۔“

ڈائریٹر صاحب بولے ”کیسے چلنے کو نہیں سکے گا؟“

میں بولا ”ایسے چلنے کو نہیں سکے گا کہ یہ ایک دم روگ ہے۔ ادائیگی فرض ہو سکتا

ہے فرض ادائیگی کہہ لیجئے زیادہ سے زیادہ ادائے فرض کہہ لیجئے کہ اس کا مطلب

بھی وقت آنے پر نکال لیا جاسکتا ہے لیکن از برائے خدا ”فرض ادا“ ناخیل فوراً

پینج کر دیجئے“

سیٹھ صاحب نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا ”تمہارا بھیجا پھرے لا ہے منسی

ناخیل پینج ہونے کو نہیں سکتا۔ اس واسطے کہ ہم فلم سچ چکا ہے“ یہ سن کر میرا بھیجا یعنی

دماغ پھر گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ میں کمپنی کے باہر تھا۔

دوسری کمپنی سے باہر نکلنے کی داستان بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ تازہ فلم کا نام ”الو

کے دو پٹھے“ تجویز ہوا۔ میں نے اعتراض کیا اور ”الو کے دو پٹھے“ کیا ہوا ”دو الو

کے پٹھے“ ہونا چاہیے جواب ملا ”تم کون ہوتے ہو مال پانی ہمارا خرچ ہو رہا ہے،

ہم چاہے گا تو پٹھے کے دو الو بھی چلے گا“ چنانچہ ”الو کے دو پٹھے“ کی شوٹنگ شروع

ہو گئی اور میں کمپنی کے باہر تھا۔

فلموں سے اب میرا دل ٹوٹنا اور کھٹا ہونا شروع ہوا اور چند برسوں ہی میں چور

نے دیکھا کہ وہ ایٹر ایس جی سب کچھ کر رہی ہے۔

بیرون کے ہاتھ کا کلوز اپ لینا تھا۔ لوگوں کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ اس کے ہاتھ بہت ہی خوب صورت ہیں مگر اس ”پری پیکر“ کی انگلیاں بہت ہی بدنماتھیں ٹیز تھیں میڑھی ڈائر ایٹر صاحب کو فوراً سوجھی جھٹ سے دس بارہ ایکسٹریڈ کیاں منگوائیں۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ اچھے تھے چنانچہ ایک دم ان پر سفیدی اور سرخی مل کر کلوز اپ لے لیا گیا اور اس پری پیکر کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ اس وقت چچا غالب یاد آ گئے۔

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا
دکھانا تھا کہ بہت زوروں کا جھکڑ چلا رہا ہے اور خطرناک قسم کا مینہ برس رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ مچان پر کئی آدمی پھولوں کو پانی دینے والے ہسپاروں میں پانی بھر بھر چھوڑ رہے ہیں۔ ایک طرف ہوائی جہاز کا پنکھا موٹر کے ذریعے سے چل رہا ہے۔ پاس ہی دو آدمی پتوں اور مٹیوں کی ٹوکریاں اٹھائے کھڑے ہیں اور مٹھیاں بھر بھر کے یہ پتے اور مٹھیاں پنکھے کے منہ پر مار رہے ہیں۔ سامنے کپڑے کا آسمان تنہا ہے ایک آدمی کبھی سوئن اون کرتا ہے اور کبھی آوف، دوسرا مین کی ایک بہت بڑی چادر کھڑکھڑا رہا ہے۔ پردے پر یہ منظر دیکھنا تو عقل کے روٹے کھڑے ہو گئے۔ منوں پانی برس رہا تھا، درخت تیز آندھی کے مقابلے میں جھکے جا رہے تھے، مٹھیاں چن رہی تھیں، خوفناک قسم کی بجلی چمک اور کڑک رہی تھی اور بیر واس طوفان میں کھڑا اپنی کشتی مردانہ وار کھ رہا تھا۔

کڑا ہے میں دودا بل رہا ہے لیکن اصل میں دیواروں پر پھیرنے والی سفیدی

ہے۔

وادی کشمیر میں برف باری ہو رہی ہے لیکن بہت سے مزدور کاغذ کے بنے ہوئے سردوں پر اوپر سے صابن کی ہوائیاں اور کاغذ کے ننھے ننھے ٹکڑے منتشر کر رہے ہیں۔

بڑے حسین قسم کا کہر چھایا ہوا ہے جس میں ملفوف ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کے ساتھ لگے محبت بھری باتیں کر رہے ہیں لیکن سیٹ پر دونوں کا سانس سوکھی گھاس کے دھوئیں میں گھٹ رہا تھا۔

ابھی ابھی ہیروئن ہیرو کے ساتھ سیٹ پر ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھی۔ شوٹنگ شروع ہوئی تو میک اپ مین نے ڈروپر سے اس کی آنکھوں میں گلیسرین کے چند قطرے ڈال دیئے اور اوصاحب، آنسوؤں کے موتی ڈھلکنے لگے۔

گا کوئی رہا ہے، لب کسی کے بل رہے ہیں۔ لکڑی کا ٹیلی فون میز پر دھرا ہے پاس ہی ایک آدمی گھنٹی لیے کھڑا ہے۔ وہ بجاتا ہے تو ہیرو صاحب جھٹ سے ریسیور اٹھاتے ہیں جیسے جج جج کال آئی ہے۔ ہیروئن گیسو بربیدہ ہے لیکن پردے پر دیکھو تو کسی زلف و راز تیل کا اشتہار دکھائی دیتی ہے۔ گھونسا چلتا ہے، لگتا لگتا کسی کے بھی نہیں لیکن دو تین آدمی چپ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ میز پر پھلوں کے انبار لگے ہیں لیکن ان میں صرف ایک کیلا اصلی ہے جو ہیرو کے والد بزرگوار کو کھانا ہے باقی سب مٹن کے ہیں، چلچلاتی دھوپ ہے لیکن کمرے پر ریڈ فلٹر لگایا اور لیجے دھوپ ٹھنڈی چاندنی میں تبدیل ہو گئی۔ زیر انہیں ماتا تو گدھے پر سیاہ و سفید دھاریاں کھینچیں اور زیر انہیں بنادیا۔

میدے کی چٹکی پھانک کر آدمی مر رہا ہے اور لوگ واویلا کر رہے ہیں۔ آدمی
اوپر سے نیچے گر رہا ہے کیمرہ اٹھا گھما دیا۔ پردے پر وہ اچک کر اوپر جاتا دکھائی
دے گا جیسے اس کے اسپرنگ لگے تھے۔ سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھے گا۔

یقین مانئے یہ بناوٹیں دیکھ دیکھ کر میرا دل کھٹا ہو گیا اور انگریزی ضرب ایشل
کے اونٹ کی کمر اس آخر تک نے توڑ دی۔ جب میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے
بنے ہوئے فلم کو ہال میں تماشا نیوں کے ساتھ دیکھا اور بیروئن کی مصنوعی پلکوں
سے پسماندے ہوئے گلیسرینی آنسوؤں نے مجھے ایک سے زیادہ بار رالایا۔

کتنا بڑا فریب ہے یہ فلم کہ خود فریب ساز بھی فریب کھا جاتے ہیں۔ خدا اب
مجھے وہ دن نہ دکھائے کہ میں فلم دیکھوں۔

☆☆☆☆☆

سویرے جو آنکھ میری کھلی

جب تھی بیمار اور جب سیر تھی یہی جی میں آئی کہ گھر سے نکل بٹلاتا بٹلاتا ذرا باغ چل۔ باغ پہنچنے سے پہلے ظاہر ہے کہ میں نے کچھ بازار اور کچھ گلیاں طے کی ہوں گی اور میری آنکھوں نے کچھ دیکھا بھی ہوگا۔ پاکستان تو پہلے ہی کا دیکھ ابا اچھا پر جب سے زندہ باد ہوا وہ کل دیکھا، بجلی کے کھمبے پر دیکھا، پر مالے پر دیکھا، شہ نشیں پر دیکھا، چمچے پر دیکھا، چوبارے پر دیکھا، غرضیکہ ہر جگہ دیکھا اور جہاں نہ دیکھا وہاں دیکھنے کی حسرت لیے گھر لوٹا۔

پاکستان زندہ باد یہ لکڑیوں کی نال ہے پاکستان زندہ باد، منافٹ مہاجر ہیر کٹنگ سیلون پاکستان زندہ باد یہاں تالے مرمت کئے جاتے ہیں۔ پاکستان زندہ باد، گرما گرم چائے پاکستان زندہ باد، بیمار کپڑوں کا ہسپتال۔۔۔۔۔ پاکستان زندہ باد، الحمد للہ کہ یہ دکان سید انور حسین مہاجر جالندھری کے نام الاٹ ہو گئی ہے۔

ایک مکان کے باہر یہ بھی لکھا ہوا دیکھا پاکستان زندہ باد۔۔۔۔۔ یہ گھر ایک پارسی بھائی کا ہے۔۔۔۔۔ یعنی حضرت کہیں اسے بھی نہ الاٹ کرا بیٹھے گا۔

صبح کا وقت تھا۔ جب بیمار تھی اور جب سیر تھی قریب قریب ساری دکانیں بند تھیں ایک حلوائی کی دکان کھلی تھی میں نے کہا چلو سی پیٹے ہیں دکان کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں بجلی کا پنکھا چل تو رہا ہے لیکن اس کا منہ دوسری طرف ہے میں نے حلوائی سے کہا ”یہ اٹے رخ پنکھا چلانے کا کیا مطلب ہے؟۔۔۔۔۔ اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا ”دیکھتے نہیں ہو۔“ میں نے

دیکھا۔۔۔۔۔ پکھے کا رخ قائد اعظم محمد علی جناح کی رنگین تصویر کی طرف تھا جو دیوار کے ساتھ آویزاں تھی۔۔۔۔۔ میں نے زور کا نعرہ لگایا ”پاکستان زندہ باد“ اور لسی پئے بغیر آگے چل دیا۔“

بند دکان کے تھڑے پر ایک آدمی بیٹھا پوریاں تل رہا تھا۔ میں سوچنے لگا ابھی پرسوں میں نے اس دکان سے چپل خریدے تھے۔ یہ پوری والا کدھر سے آگیا۔ خیال آیا شاید کوئی دوسری دکان ہو لیکن بوڑھو ہی تھا سامنے وہی فسادات میں جھلسا ہوا مکان تھا جس کی برساتی میں بجلی کا پنکھا لٹک رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا آگ جلانے میں اس نے بھی کافی مدد دی ہوگی۔ پوری والے نے مجھے مخاطب کیا اور کہا ”کیا سوچ رہے ہیں آپ بابو جی گرم پوریاں ہیں“ میں نے کہا ”بھئی میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جہاں تم بیٹھے ہو، یہاں جوٹوں کی دکان ہوا کرتی تھی“ پوری والا اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر مسکرایا ”جوٹوں کی دکان اب بھی ہے لیکن وہ نو بجے شروع ہوتی ہے اور میری صبح چھ بجے سے شروع ہوتی ہے اور ساڑھے آٹھ بجے ختم ہو جاتی ہے۔“

میں آگے بڑھ گیا۔

کیا دیکھتا ہوں ایک آدمی سڑک پر کانچ کے ٹکڑے بکھیر رہا ہے۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ بھلا آدمی ہے اس بات کا احساس رکھتا ہے کہ لوگوں کو تکلیف دیں گے اس لیے سڑک پر سے چن رہا ہے لیکن جب میں نے دیکھا کہ چنے کی بجائے وہ بڑی ترتیب سے انہیں ادھر ادھر گرا رہا ہے تو میں کچھ دو رکھڑا ہو گیا۔

جھولی خالی کرنے کے بعد وہ سڑک کے کنارے بچھے ہوئے ناٹ پر بیٹھ گیا۔

پاس ہی ایک درخت تھا۔ اس پر ایک بوڑ لگا تھا ’’یہاں سائیکوں کے پنچر لگائے جاتے ہیں اور ان کی مرمت کی جاتی ہے‘‘ میں نے قدم تیز کر دیئے۔

دکانوں کے سائن بورڈوں میں ایک خوشگوار تبدیلی نظر آنی پہلے قریب قریب سب انگریزی میں ہوتے تھے۔ اب کچھ دکانوں پر نام اور تحریر دونوں اردو لباس میں نظر آئے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے جیسا دلیس ویسا بھیس

تحریر خوش خط تھی اور نام بھی جاذب نظر تھے۔ مثال کے طور پر ’’آرائش‘‘ ظاہر ہے کہ دکان میں آرائش سے متعلق سامان ہوگا ایک ہوٹل کھاتا تھا اس کی پیشانی پر عربی رسم الخط میں ’’ماحضر‘‘ لکھا تھا۔ آگے چل کر ایک دکان تھی جس کا نام ’’پاپو شیانہ‘‘ تھا یعنی جوٹوں کا آشیانہ ایک دکان کی پیشانی پر یہ بورڈ آویزاں تھا ’’زمہری‘‘ ضرورتیوں کی دکان تھی

میں نے خوش ہو کر ’’پاکستان زندہ باد‘‘ کہا اور چلتا رہا۔

چلتے چلتے سائیکل کے چار پہیوں پر ایک عجیب وضع کی ہاتھ گاڑی دیکھی پوچھا ’’یہ کیا ہے؟‘‘ جواب ملا ’’ہوٹل‘‘۔۔۔۔۔ چلتے پھرتا ہوٹل تھا۔ چپاتیاں پکانے کے لیے انگلیٹھی اور توامو موجود۔ چار سالن تیار شامی کباب تانے کے لیے فرانی پین حاضر، پانی کے دو گھڑے، برف لیمنیڈ کی بوتلیں، دہی کا کوئڈا۔ لیمنوں نچوڑنے کا کھٹکا۔ گلاس پلیٹیں غرضیکہ ہر چیز موجود تھی۔

کچھ دور آگے بڑھتا دیکھا، ایک آدمی چھوٹے سے لڑکے کو دھڑا دھڑ پیٹ رہا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا لڑک انوکھ ہے اور اس نے ایک روپے کا

کتوں نے حملہ کر دیا۔۔۔۔۔ پاکستان کے ایک نجومی کی پیش گوئی کشمیر دو ہفتوں میں آزاد ہو جائے گا۔

سینکڑوں ہی اخبار تھے۔ آج کا تازہ ”نوائے صبح“۔۔۔۔۔ آج کا تازہ ”ابو الوقت“۔۔۔ آج کا تازہ ”سنہرا پاکستان“

اخبار فروش لڑکوں کا سیلاب گزر گیا تو ایک عورت نظر آئی۔ عمر یہی کوئی پچاس کے لگ بھگ سنجیدہ اور متین صورت ایک ہاتھ میں تھیماتھا دوسرے میں اخباروں کا بندل میں نے پوچھا ”کیا آپ اخبار بیچتی ہیں“ مختصر جواب ملا ”جی ہاں“ میں نے دو اخبار خریدے اور دل میں اس اخبار فروش خاتون کا احترام لیے آگے بڑھ گیا۔

تموڑی، جی دیر میں کتوں کا ایک غول نمودار ہوا بھونک رہے تھے ایک دوسرے کو کھنھوڑ رہے تھے۔ پیار کر رہے تھے اور کاٹ بھی رہے تھے۔ میں ڈر کے ایک طرف ہٹ گیا کیونکہ پندرہ روز ہوئے ایک کتے نے مجھے کاٹ کھایا تھا اور پورے چودہ دن، دس سی سی کے ٹیکے مجھے اپنے پیٹ میں بھگوانے پڑے تھے۔

میں نے سوچا کیا یہ سب کتے پناہ گیر ہیں یا وہ ہیں جو یہاں سے جانے والے اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں کوئی بھی ہوں، ان کا خیال تو رکھنا چاہیے جو پناہ گیر ہیں۔ ان کو پھر سے آباد کیا جائے اور جو بے آقا ہو گئے ہیں۔ ان کو ان کی نسل کے اعتبار سے ان لوگوں کے نام لٹا کر دیا جائے۔ جن کے کتے اس پار رہ گئے ہیں اور جن کا کوئی وانی وارث نہیں ان کے لیے لکڑی کی ٹانگیں مہیا کی جائیں تاکہ وہ ان جی سے اپنا شغل پورا کرتے ہیں۔

کتوں کا غول چلا گیا تو میری جان میں جان آئی میں نے قدم بڑھانے شروع کیے میں نے ایک اخبار کھولا اور اسے دیکھنا شروع کیا سرورق پر ایک فلم ایٹریس کی تصویر تھی، تین رنگوں میں، ایٹریس کا جسم نیم عریاں تھا، نیپے یہ عبارت تھی۔

”فلموں میں بے حیائی کا مظاہرہ کیسے کیا جاتا ہے اس کا کچھ اندازہ اس تصویر سے ہوتا ہے۔“

میں نے دل ہی دل میں ”پاکستان زندہ باد“ کا نعرہ لگایا اور اخبار کو فٹ پاتھ پر پھینک دیا دوسرا اخبار کھولا ایک چھوٹے سے اشتہار پر نظر پڑی مضمون یہ تھا ”میں نے کل اپنی سائیکل لائینڈ زبینک کے باہر رکھی۔ کام سے فارغ ہو کر جب لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سائیکل پر پرانی گدی کسی ہوئی لیکن نئی غائب ہے۔ میں غریب مہاجر ہوں جس صاحب نے لی ہو، براہ کرم مجھے واپس کر دیں۔“ میں خوب ہنسا اور اخبار تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

چند گزروں کے فاصلے پر ایک جلی ہوئی دکان دکھائی دی اس کے اندر ایک برف کی دو موٹی موٹی ملیں رکھے بیٹھا تھا میں نے دل میں کہا ”اس دکان کو آخر کار کسی طرف سے ٹھنڈک پہنچ ہی گئی۔“

دو تین سائیکلیں دیکھیں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مرد چلا رہے تھے اور ایک برقع پوش عورت پیچھے کیئرئیر پر بیٹھی تھی۔ پانچ پھ منٹ کے بعد ایک اور اسی قسم کی سائیکل نظر آئی لیکن برقع پوش عورت آگے بینڈل پر بیٹھی تھی۔ دفعۃً خبر بوزے کے چھلکے پر سے سائیکل پھسلی۔ سوار نے بریک دبائے پھسلنے اور بریک لگنے کے

دوہرے عمل سے سائیکل الٹ کر گری میں دوڑا دے کے لیے مرد عورت کے برقع میں لپٹا ہوا اور عورت بے چاری سائیکل کے نیچے دبئی ہوئی تھی۔ میں نے سائیکل ہٹائی اور اس کو سہارا دے کر اٹھایا مرد نے برقع میں سے منہ نکال کر میری طرف دیکھا اور کہا ”آپ تشریف لے جائیے ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت نہیں“ یہ کہہ کر وہ اٹھا عورت کے سر پر اووندھا سیدھا برقع اٹکایا اور اس کو بینڈل پر بٹھا، یہ جاوہ جا۔۔۔۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ آگے ٹرک پر خربوزے کا کوئی اور چھلکا نہ پڑا ہو۔

تموڑی ہی دور دیوار پر ایک اشتہار دیکھا جس کا عنوان بہت ہی معنی خیز تھا ”مسلمان عورت اور پردہ۔“

بہت آگے نکل گیا۔ جگہ جانی پہچانی تھی مگر وہ بت کہاں تھا جو میں دیکھا کرتا تھا میں نے ایک آدمی سے جو گھاس کے تنختے پر استراحت فرما رہا تھا، پوچھا ”کیوں صاحب یہاں ایک بت ہوتا تھا، وہ کہاں گیا؟“

استراحت فرمانے والے نے آنکھیں کھولیں اور کہا ”چلا گیا“

”چلا گیا آپ کا مطلب ہے اپنے آپ چلا گیا؟“

وہ مسکرایا ”نہیں اسے لے گئے“

میں نے پوچھا ”کون“

جواب ملا ”جن کا تھا“

میں نے دل میں کہا ”لو اب بت بھی ہجرت کرنے لگے۔۔۔۔۔ ایک

دن وہ بھی آئے گا جب لوگ اپنے اپنے مرد بھی قبروں سے اکھاڑ کر لے جائیں

گئے۔“

یہی سوچتا ہوا قدم اٹھنے والا تھا کہ ایک صاحب نے جو میری ہی طرح ٹبل رہے تھے مجھ سے کہا ”بت کہیں گیا نہیں یہیں ہے اور محفوظ ہے۔“

میں نے پوچھا ”کہاں؟“

انہوں نے جواب دیا ”غائب گھر میں“

میں نے دل میں دعا مانگی ”اے خدا! وہ دن نہ لائیو کہ ہم سب غائب گھر میں رکھے جانے کے قابل ہو جائیں۔“

فٹ پاتھ پر ایک دہلوی مہاجر اپنے صاحبزادے کے ساتھ سیر فرما رہے تھے۔ صاحبزادے نے ان سے کہا ”اباجان! ہم آج چھو لے کھائیں گے۔“

اباجان کے کان سرخ ہو گئے ”کیا کہا؟“

برخوردار نے جواب دیا ”ہم آج چھو لے کھائیں گے“

اباجان کے کان اور سرخ ہو گئے ”چھو لے کیا ہوا، چنے کبڑ“

برخوردار نے بڑی معصومیت سے کہا ”نہیں اباجان! چنے دلی میں ہوتے

ہیں۔ یہاں سب چھو لے ہی کھاتے ہیں“ اباجان کے کان اپنی اصلی حالت پر آ گئے۔

میں ٹبلتا ٹبلتا الارنس باغ پہنچ گیا۔ وہی باغ تھا پرانا لیکن وہ چہل پہل نہیں تھی۔ صنف نازک تو قریب قریب مفتوحہ تھی۔ پھول کھلے ہوئے تھے، کلیاں چٹک رہی تھیں۔ ہلکی چٹکی فضاء میں خوشبوئیں تیر رہی تھیں۔ میں نے سوچا، عورتوں کو کیا ہوا ہے جو گھر میں قید ہیں۔ ایسا خوبصورت باغ، اتنا سہانا موسم، اس سے لطف

اندوز کیوں نہیں ہوتیں۔۔۔۔۔ لیکن مجھے فوراً ہی اس سوال کا جواب مل گیا۔ جب میرے کانوں میں ایک نہایت ہی بھونڈے اور سوقیانہ گانے کی آواز آئی اور جب میں اارنس باغ کی روشنیوں پر پھیٹی پھیٹی نگاہوں والے گوشت کے بے ہنگم لوتھڑوں کو محو خرام دیکھا تو مجھے دکھ ہوا اور اس دکھ میں اضافہ ہو گیا۔ جب میں نے سوچا کہ پھول بے کار کھل رہے ہیں۔ نکایاں بے مطلب چٹک رہی ہیں۔ یہ جوان کی طرف دیکھے بغیر چلے جا رہے ہیں۔ یہ جوان کے تپتر سے بالکل بے خبر ہیں۔ کیا ان کی جگہ اس باغ کے بجائے کوئی ذہنی شفا خانہ نہیں۔ کوئی مدرسہ نہیں جہاں ان کے دماغوں کی بند کھڑکیاں کھولی جائیں۔ ان کی روحوں کے رنگ آلود تالے فوڑے جائیں۔ اگر کوئی ایسا نہیں کر سکتا میرا مطلب ہے اگر انسان کا ذہن عاجز ہے ان انسانوں کے ذہن کی اصلاح کرنے میں تو کیا وہ انہیں چدیا گھر میں نہیں رکھ سکتا جو اارنس گاؤن ہی میں قائم رہے۔

میری طبیعت مکدر ہو گئی۔ باغ سے باہر نکل رہا تھا کہ ایک صاحب نے پوچھا ”کیوں صاحب یہی باغ جناح ہے؟“

میں نے جواب دیا ”جی نہیں یہ لائسنس باغ ہے“

وہ صاحب مسکرائے ”آپ جڑیا گھر سے تشریف لارہے ہیں؟“

”جی ہاں!“

وہ صاحب ہنس پڑے۔ قبلہ جب سے پاکستان قائم ہوا ہے۔ اس کا نام باغ جناح ہو گیا ہے میں نے ان سے کہا ”پاکستان زندہ باد“ وہ اور زیادہ ہنستے ہوئے انرس باغ میں چلے گئے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں دوزخ سے باہر نکلا ہوں۔

حقا کہ باعقوبت دوزخ برابر است
رفتن بہ پائے مردی ہمسایہ در بہشت

☆☆☆☆☆

یوم اقبال پر

معزز حاضرین اور میرے ہم قلم رفیقو!

یوم اقبال کی اس پہلی نشست کی صدارت کا اعزاز جو آپ نے مجھے بخشا ہے
رسماً مجھے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے لیکن بندہ سرگشتہ رسوم و قیود نہیں۔

صدارت کی کرسی کی طرف دیکھ کر البتہ ایک الجھن سی ضرور ہوتی ہے۔ اتنی دیر
گالیاں اور سٹھنیاں کھاتا رہا اور آج۔۔۔۔۔۔ لیکن علامہ اقبال مرحوم کے
ساتھ کیا ہوا تھا۔ اپنے زمانے میں اعلیٰ طعن کے علاوہ ان کو تو الحاد اور کفر کے فتوؤں
سے بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔ ایسا سوچئے پر یہ الجھن تو کسی حد تک دور ہو جاتی ہے
لیکن ایک دوسری الجھن جو اس وقت مجھے محسوس ہوتی ہے یہ ہے کہ شاعری سے
مجھے اتنا شغف ہے جتنا مہاتما گاندھی کو فلموں سے تھا۔ بہر حال مجھے اس موقع
سے فائدہ اٹھانا چاہیے جو آپ حضرات نے مجھے دیا ہے۔

اقبال کے کلام سے میرا سب سے پہلا تعارف ہوٹل کے بل سے ہوا۔ آج
سے تقریباً پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ زندگی سے قطعاً مایوس ہو کر میں فرار کے
طور پر کھیل کھیل رہا تھا۔ ایک رات، غم غلط کرنے کے سامان کے دام چکانے لگا تو
بل کی پرچی کی پشت پر فارسی کا یہ مصرعہ نظر آیا۔

اگر خوابی حیات، اندر خطر زری

کسی ہم مشرب کی بروقت نصیحت تھی یا پیرمغان کی شفقت آج یہ عالم ہے کہ
زندگی چاہے مجھ سے مایوس ہو جائے میں اس سے مایوس ہونے کا کبھی نام نہیں

لیتا۔ مہنگے سے مہنگے داموں پر خطرے مول لیتا ہوں اور اونے پونے داموں بیچ دیتا ہوں لیکن خدا گواہ ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔

اقبال کے کلام سے مزید تعارف بھی اسی زمانے سے ہوا۔ ایک کتب فروش نے مجھے ڈرتے ڈرتے ”بال جبریل“ دکھائی اور سب سے پہلے وہ نظم پڑھنے کیلئے کہا جس کا عنوان شاید فرمان خدا ہے۔ ہم دونوں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بیک زبان ہو کر پڑھا۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

ان دنوں اقبال کو بالائیک یعنی روس کا ایجنٹ سمجھا جاتا تھا۔ آج جب کہ یہاں آزاد اسلامی حکومت قائم ہے۔ خدا کا یہی فرمان دہرانے کے لیے کمیونسٹ کہلاتے ہیں اور ان کے سر پر قانون کا غتاب منڈلاتا رہتا ہے لیکن خدا کا اتنا شکر ہے کہ اقبال کا کلام اس قسم کے احتساب سے آج کل محفوظ ہے۔

پچھلے دنوں یہ خبر سننے میں آئی کہ مغربی پنجاب کے ایک گاؤں میں مہاجر کسانوں نے اناج کے ایک بہت بڑے ذخیرے کو آگ لگا دی اس لیے کہ جاگیرداروں نے رات ہی رات اسے چرا کر اپنے گوداموں میں بھر لیا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ ضروری نہیں کہ مخلص آرٹسٹ کا پیغام کتابوں، تصویروں اور آوازوں ہی سے لوگوں تک پہنچے۔ جب کوئی آرٹسٹ ساز زندگی کے کسی تار کو چھیڑتا ہے تو اس کی لرزش کی گونج صدیوں تک فضاؤں میں تیرتی رہتی ہے اور کھینچ کر خود بخود دل کے ان تاروں تک پہنچ جاتی ہے جو اذیت دینے والے ہاتھوں نے جھنجھوڑے

کر کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نور بصیرت بہت دیر تک جہالت کی
تنگ اور اندھیری گلیوں میں بھٹکتا رہے گا۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے بیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

☆☆☆☆☆

محبوس عورتیں

تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کے بعد اس قدر مجاسی و معاشرتی مسائل پیدا ہوئے ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ یوں تو ہر شخص انہیں سلجھانے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شور زیادہ ہے اور کام بہت ہی کم ہو رہا ہے۔ برطانوی سامراج کی حکمت عملی نے وہ شاطرانہ چال چلی کہ ٹھنڈے سے ٹھنڈے دماغوں کو بھی سوچنے کا موقع نہ ملا۔ ہندوستان کو اس چابک دست جراح نے پتھر کی سرد سلوں پر لٹا کر چیرا پھاڑا۔ ایک سنگین سکون و اطمینان کے ساتھ اس کے حصے بھرے کئے اور یہ جاوہر جا۔ اور وہ جن کے مدبر، وہ جن کی دقیقہ رسی، وہ جن کی شاہیں نگاہی کی سارے عالم میں دھوم تھی۔ آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔

بچپلے چند مہینوں میں اس سرزمین پر جس کا نام کبھی ہندوستان تھا۔ خون کے وہ دریا بہے کہ جس پر چشم فلک بھی حیران ہے۔ فنا کو بادہ ہر جام بنایا گیا۔ دوسری اجناس مایاب مگر انسانی گوشت پوست کی دکانیں عام کچی تھیں۔ ہر بازار میں ایک عام ٹانگی نصب تھی۔ ہر چوک میں ایک قفل تھا۔ چنگیز اور ہلاکو، امیت تیور گورگانی، نادر شاہ درانی اور بہمت و بربریت کا تازہ ترین ملمبر دار اوڈلف ہٹلر بھی اگر ان خونیں مناظر کو دیکھتا تو یقیناً خود کو مایہ چیز سمجھتا لہو اور لوہا، جنگ اور تفرنگ انسان کی تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں۔ اولاد آدم ان کھیلوں میں ہمیشہ دلچسپی لیتی رہی ہے مگر وہ کھیل جو بچپلے دنوں کھیلا جاتا رہا ہے۔ اس کی مثال ابن آدم کے رنگین فسانے میں کہیں بھی نہیں ملتی۔

خود کو حیوانوں سے کچھ اونچا رکھنے کے لیے انسان نے قتل و غارت گری کے لیے بھی کچھ آداب و قواعد بنا رکھے ہیں لیکن جس قتل و غارت گری کا ہم ذکر کرتے ہیں۔ ان آداب و قواعد سے بے نیاز تھی بلکہ یوں کہنے کہ حیوانیت سے بھی یکسر مبرا تھی۔ جس کی تصویر شاید یہ قتل و غارت گری خود بھی نہ کھینچ سکے۔

اس وقت ہماری نظروں کے سامنے خون کی سوکھی ہوئی پڑیاں کٹے ہوئے اعضا جملے ہوئے چہرے، روندھے ہوئے گٹے، ٹھٹھری ہوئی جانیں، لٹے ہوئے مکان، جلے ہوئے کھیت، ملے کے ڈھیر اور بھرے ہوئے ہسپتال ہیں۔ ہم آزاد ہیں، ہندوستان آزاد ہے، پاکستان آزاد ہے اور ہم گرسلی و بربکی، بے سرو سامانی اور بے حالی کی ویران سڑکوں پر چل پھر رہے ہیں۔

گند نہیں ہے، روٹی نہیں ہے، چاول نہیں ہے، گرانی ہے، قحط ہے، بیماریوں کی یاخار ہے، سردیوں میں آگ نہیں، گرمیوں میں پانی نہیں، زمینیں سکڑ گئی ہیں، آسمان سکڑ گئے ہیں، تدبیر کے گھسے ہوئے ناخن یہ پیچیدہ گرہیں کھولنے میں مصروف ہیں اور ہم محو تماشا ہیں۔

ٹھنڈی زمینوں پر اُٹی ہوئی ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ کے آخری قطرے منجمد ہو رہے ہیں۔ قدرت کا بے رحم ہاتھ بچوں کو ان کے آخری اٹاٹے سے محروم کر رہا ہے لیکن ایسی حویلیاں بھی ہیں جہاں ننھے کا بچا ہوا دودھ موریوں میں بہایا جاتا ہے۔ لاکھوں ستم رسیدہ تن ڈھانپنے کے لیے ایک چیتھڑے کو ترس رہے ہیں لیکن وہ بھی ہیں جو فیشن کی نوک پلک درست رکھنے کے لیے طرح طرح کے ملبوسات سے اپنی الماریاں سجائے بیٹھے ہیں۔

یہ تماشا کب تک جاری رہے گا۔ کب تک مظلوم انسانیت کپڑے کے پھٹے ہوئے خیموں میں قید رہے گی، کب تک مجبور نسوانیت تحفظ کی نام نہاد چار دیواری میں شہوانیت کی شکار ہوتی رہے گی۔ کب تک غربت و بے چارگی سرمائے کے ہاتھوں فروخت ہوتی رہے گی۔ کب تک؟

ہماری بیٹی ہوئی تہذیب ہمارا تقسیم شدہ تمدن، ہمارا بچا ہوا تن۔ ہر وہ چیز ہمارے ہی جسم سے کٹ کر ہمیں ملی ہے۔ مغربی سیاست کے جھوٹلے میں دفن ہے۔ ہمیں ان سب کو نکالنا ہے، جھاڑنا پونچھنا ہے، تروتازگی بخشنا ہے اور اس طوفان میں جس جس شے سے ہم محروم ہوئے ہیں اسے دوبارہ حاصل کرنا ہے لیکن سب سے پہلے ہمیں ان زخموں کی دیکھ بھال کرنا ہے جو ذرا سی غفلت پر ماسور بن جانے والے ہیں۔ سب سے بڑا گھناؤنا زخم ان عورتوں کا وجود ہے جن میں سے کچھ ہماری بزدلی کے باعث بے لگام شہوانیت کا شکار ہوئیں اور کچھ مخالفین کی ”شہزوری“ کا نشانہ شق بنیں۔ کہا جاتا ہے ایسی پچاس ہزار عورتیں موجود ہیں، مائیں، بہنیں اور بچیاں ان میں سے چند ہزار کی بازیابی ہو چکی ہے۔ جو باقی ہیں ابھی تک شہوت کے تنوروں میں ایندھن کا کام دے رہی ہیں۔

پچھلے دنوں قائدین ملت کے ایماء پر ان مظلوم و مقہور عورتوں کی بازیابی کی مہم بڑے زور شور سے شروع ہوئی تھی مگر افسوس ہے کہ اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمیں اس کا اتنا زیادہ گلہ نہیں اس لیے کہ اس مہم کا انحصار زیادہ تر فریق ثانی کے دل کھلنے پر تھا لیکن اس بات کی شکایت ہمیں ضرور ہے کہ ان عورتوں کے متعلق جو ہمیں واپس مل چکی ہیں۔ نفسیات کی روشنی میں بہت کم غور کیا گیا ہے۔

ان گھائل روحوں کے لیے کسی جیل میں ایک وارڈ مخصوص کر دینے سے اور تفریح کے لیے وہاں ایک عدد ریڈیو سیٹ لگا دینے سے یا کسی خوش پوش امیر زادی کے معائنے میں ان کی تقدیر کی ریفو گیری نہیں ہو سکتی اور پھر ان کے تاریک مستقبل کو روشن بنانے کے لیے یہ بھی کوئی حل نہیں کہ ان کو سپاہیانہ تعلیم دے کر ”فوجی گوروں“ کی تانیٹ بنا دیا جائے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ سب سے پہلے اس نشان کو مٹانے کی کوشش کی جائے جو ان تقدیر کی بیٹیوں کی پیشانی پر حادثات کی سیاہی لگا گئی ہے اور اس کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے لیے اپنی معاشرت میں صحت افزا جگہ پیدا کی جائے۔

یہ عورتیں غریب ہوں یا امیر، کنواری ہوں یا بیواہی ہوئی، مال گاڑی کا نقصان رسیدہ اسباب نہیں جو انہیں کچھ دن گودام میں رکھ کر نیلام پر چڑھا دیا جائے اور اگر کچھ مصرف سمجھ میں نہ آئے تو انہیں تلف کر دیا جائے۔

ہزاروں عورتوں کا سوال ہے جو کبھی ماؤں کی بیٹیاں، بھائیوں کی بہنیں اور شوہروں کی بیویاں تھیں۔ جس حالت میں یہ اب ہیں اس کی ذمہ دار سیاست کی اکھاڑے بازی ہے۔ مذہب کا وہ جنون ہے جس کی مثال انسانوں کی پچھلی تاریخ میں کہیں بھی نہیں ملتی اور کچھ نہیں تو ان عورتوں کے وجود کو اپنا ہی گناہ سمجھ کر ہمیں پردہ پوشی کرنی چاہیے۔

اگر فوری طور پر کچھ نہ کیا گیا تو ان عورتوں کا شکستہ حال ایک بہت ہی خوف ناک خرابی میں تبدیل ہونے والا ہے سینکڑوں بلکہ ہزاروں فوجہ خانے منہ کھولے

ان کے استقبال کے لیے تیار ہیں۔ ہمیں اس کے تصویری سے کانپ جانا چاہیے اور پھر وہ بچے ہیں جو کئی عورتوں نے اپنی مجبور کوکھ سے پیدا کئے ہیں۔ اس خود روپود کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کون ہے۔ کون ہو گا اور کون ہو سکتا ہے یہ آپ کو سوچنا ہے یہ مجھے سوچنا ہے، یہ ہمارے ان رہنماؤں کو سوچنا ہے جو اس سر زمین کے خاوند ہیں اور سب سے پہلے یہ سوچنا ہے کہ وہ لوگ صرف سوچنے کی خاطر سوچتے ہیں۔ عملی زندگی میں ان کا کیا مصرف ہے؟ یہ مسائل ایسے ہیں کہ ان پر فوری تدبیر اور عمل کی ضرورت ہے۔ کرسی نشین فکر و عمل اور تن آسان تدبیر و تنظیم سے ہمارے مجلسی دائرے کا یہ چاک ہرگز ہرگز رونہ ہو گا۔ ضرورت ہے کہ ملک کے تمام ماہرین نفسیات مل کر ان مظلوم عورتوں اور ان کی جبری اولاد کے لیے زندگی میں ایک صاف اور ہموار راستہ تلاش کریں تاکہ یہ سماج کے جذباتی قوانین کی ٹھوکروں سے بچے رہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور یہ نازک مسئلہ اناڑیوں کے سپرد رہا تو اندیشہ ہے کہ حالات تاریک سے تاریک ہو جائیں گے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اخباروں میں ان عورتوں کے فوٹو شائع کرنے سے کس قسم کا اثر پیدا کرنا مقصود ہے۔ دیکھنے والے ان کے چہروں کی مصنوعی مسکراہٹیں ضرور دیکھتے ہیں لیکن سمجھنے والی بخوبی سمجھتے ہیں کہ یہ کاغذ ان کی آنکھوں کے وہ آنسو جو کہ وہ بہا چکی ہیں اور جو آئندہ بہانے والی ہیں۔ ہرگز خشک نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ ان عورتوں کے وجود کی ایسی حامیانہ تشہیر غایت درجہ قابل اعتراض ہے۔ افسوس ہے کہ جو کام ہمیں خاموشی، سنجیدگی اور متانت سے کرنا چاہیے تھا۔ اس میں غیر ضروری بلند آہنگی برتی جا رہی ہے۔ یہ سراسر پھوہڑ پن ہے۔ جو حقیقت ہے اور

ایک بہت ہی تلخ حقیقت ہے ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں دہنی چاہیے۔ یہ تلخ حقیقت انسانیت کی اس ذلت آفرین افتاد کے سوا اور کیا ہے جس نے ان معصوم عورتوں سے ایسا گھناؤنا سلوک کیا۔ ہمیں رجائی بن کر اسی انسانیت سے رجوع کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے پہنچائے ہوئے نقصان کی تلافی کر سکے۔ انسانیت کا گناہ سب انسانوں کا گناہ ہے۔ وہ عظیم ترین گناہ جو چند گمراہ انسانوں سے سرزد ہو چکا ہے۔ آئیے ہم سب مل کر اس کا غارہ ادا کریں کہ اسی میں ہماری ان عورتوں کی، ان کے بچوں کی، پاکستان اور اورہندوستان کی بھی نجات مضمر ہے۔

ہم جانور پال سکتے ہیں۔ حیوانوں کو اپنے سینے سے لگا سکتے ہیں۔ کیا ہم ان عورتوں اور ان کے بچوں کو اپنے گھر میں جگہ نہیں دے سکتے؟ یہ سوال ایسا ہے جس کا جواب سب سے پہلے ہمارے رہنماؤں کو دینا چاہیے تاکہ عوام کو جو تقلید کے عادی ہیں اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کا موقع ملے۔

☆☆☆☆☆

ایمان و ایقان

یو ایس اور یڈیو

ہم کامیابی کی جھیل کی گہرائیوں سے بول رہے ہیں، امن پسند لوگ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ روس اور امریکہ کے تنازعے کا خاطر خواہ فیصلہ ہو گیا ہے۔ طے پایا ہے کہ ان دونوں حکومتوں کی ایٹمی طاقت کی اوپن ایئر نمائش ہو۔ اس ڈنگل میں جس کے دم خم دوسرے کے مقابلے میں زیادہ ہوں گے۔ دنیا کی باگ ڈور تھامنے کا اہل قرار دیا جائے گا۔ چار بڑی طاقتوں نے اپنے اپنے معنف اس ڈنگل میں حصہ لینے کے لیے بذریعہ جٹ پروپلڈ ہوائی جہاز روانہ کر دیئے ہیں۔ قوی امید ہے کہ دنیا کے اس سب سے بڑے تنازعے کا فیصلہ دوستانہ فضاء میں بطریق احسن ہو جائے۔

یو ایس اے ریڈیو

ہم چار بڑی آزادیوں کی کوکھ سے بول رہے ہیں، کامیابی کی جھیل کی گہرائیوں میں ہمارے اور روس کے تنازعے کا جو فیصلہ ہوا ہے۔ اس وقت تک کامیاب نہیں کہا جاسکتا۔ جب تک ایٹمی طاقت دریافت کرنے کے معاملے میں فریق ثانی ہمیں مجتہد تسلیم نہ کر لے۔ ہم ڈنگل لڑنے کے لیے بسروپشتم تیار ہیں لیکن

اکھاڑے میں پہلے ہمارا مد مقابل ہمیں اپنا استاد تسلیم کر لے۔

یو ایس ایس آر ریڈیو

ہم ہتھوڑے اور درانتی کی آواز کے ساتھ بول رہے ہیں۔ فریق ثانی کے باند باگ دعوے ہم سن چکے ہیں۔ پدرم سلطان بود کا زمانہ لد گیا۔ امریکا۔ کوئٹہ نے دریافت کیا تھا لیکن اس غریب کے نلک کو بھی ایٹمی طاقت کا علم نہیں تھا۔ ہم اس میدان میں ٹفل مکتب ہی ہی لیکن پنچہ ڈال کر دیکھ لیا جائے کہ طاقتور کون ہے۔

یو ایس آر ریڈیو

ہم کامیابی کی جھیل میں خوشی کے گیت گاتے اور ڈبکیاں لگاتے ہوئے بول رہے ہیں۔ ہمارے خوشی کے گیت کے پہلے بول یہ ہیں کہ روس اور امریکا نے ایک دوسرے کو چند سیاسی سٹھنیاں دینے کے بعد یورینیم اور پلوٹینیم پر ہاتھ رکھ کر صاف ڈگل اڑنے کا حلف اٹھالیا ہے۔

بریں مرودہ گر جاں فشانم رواست

یو ایس ایس آر ریڈیو

یورینیم اور پلوٹینیم پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھانے کے بعد ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کا احترام کریں۔ چنانچہ بین الاقوامی قواعد و ضوابط کے پیش نظر مسابقت کے

ڈنگل میں حصہ لینے سے پہلے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ نمونے کے طور پر ایک ایٹم بم امریکہ روانہ کر دیں تاکہ وہاں کے ماہرین اچھی طرح ٹھونک بجا کر اس کی طاقت کا اندازہ کر لیں۔ جس سے ہمارے دعوؤں کا جھوٹ سچ ان پر واضح ہو جائے گا۔ نمونے کے اس ایٹم بم کی روانگی کے وقت کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

یو ایس اے ریڈیو

اجتہاد اور پہل ہمیشہ ہمارا حصہ رہا ہے اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ایٹم بم کا نمونہ پہلے یہیں سے روانہ کیا جائے۔۔۔۔۔ چنانچہ چار بڑی آزادیوں کے نقارے پر چوٹ لگا کر اس کا اعلان کیا جاتا ہے کہ آج چار بج کر سوا چھیالیس منٹ، گرین وچ ٹائم پر چچا سام اپنے بہترین اور خوبصورت ترین ایٹم بم کا نمونہ روس کے ماہرین کی جانچ پڑتال کے لیے روانہ کر دیں گے۔

یو ایس ایس آر ریڈیو

(ہوم سروس) امریکہ۔ سیاٹم بم کی روانگی پر متحدہ جمہوریہ روس میں جو خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی ہے۔ سرخ قائدین کے نزدیک بہت ہی شرمناک ہے ہمارے سائنس دان جو ایٹم بم کی رگ رگ اور نخ نخ سے واقف ہیں اس کے استقبال کے لیے چشم براہ ہیں۔

یو ایس ایس آر ریڈیو

دراستی اور ہتھوڑے کی مار اور کٹ کا فیصلہ آج ہو جائے گا ہم نے بھی آج چار بج کر سوا چھیالیس منٹ، گرین وچ ٹائم پر اپنا برا بھلا ایٹم بم نمونے کے طور پر امریکہ کے ماہرین کی خدمت میں روانہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے یہ بم 500 میل فی گھنٹے کی رفتار سے مسافت طے کرے گا۔

یو ایس اے ریڈیو

(ہوم سروس) ہمارے سائنس دانوں نے عظیم ترین دور بینوں کے ذریعے سے روس کے جیسے ہوئے ایٹم بم کا معائنہ کر لیا ہے اور یقین دلایا ہے کہ وہ اسے واپس بھیجنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ اس لیے لوگوں کو بے وجہ مضطرب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

یو ایس اے ریڈیو

ہمارا بھیجا ہوا نمونے کا ایٹم بم اس بم سے دس ہزار گنا بڑا ہے جو ہم نے بیروشیما پر گرایا تھا۔ امید ہے روس کے ماہرین نے اب تک اس کا اندازہ کر لیا ہوگا جو ایٹم بم روس نے ہماری طرف روانہ کیا ہے اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

یو ایس ایس آر ریڈیو

قد و قامت اور ڈیل ڈول کی طرف ازمنہ تحقیق کے لوگ دیکھتے تھے۔ عہد جدید میں اس پرانے گز سے کسی کی طاقت ماپنا از حد منہکا خیز ہے۔ امریکہ کے ایٹم بم کی حقیقت ہمارے سائنس دانوں نے دور ہی سے دیکھ کر معلوم کر لی ہے اور وہ گریہی اپنے معمول میں تلاش کر لیا ہے جس سے امریکہ کی یہ سوغات شکرینے کے ساتھ اٹھائی جائے گی۔

یو ایس اے ریڈیو

ہماری تیاریوں میں صرف ایک انچ کی کسرتھی مگر اب ہم بصد فخر و ابہتاج یہ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے قابل سائنس دانوں نے روس کے ایٹم بم کو عین جب کہ وہ ہماری سرحدوں میں داخل ہونے والا تھا کہ بمک ریز کے زور سے دھکا دے کر واپس روس بھیج دیا ہے۔

یو ایس ایس آر ریڈیو

ہم نے امریکہ کے ایٹم بم کو ایسا ریا دیا ہے کہ پانچ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آنے کے بدلے اب یہ سات سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے واپس جا رہا ہے لیکن اس کے برعکس ہمارا ایٹم بم بہت سست رفتاری سے ہماری پاس واپس آ رہا

ہے۔

یو ایس اے ریڈیو

رفتار تیز اور سست کرنا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ حکم دے دیا گیا ہے کہ روسی ایٹم بم کی واپسی کی رفتار سات سو میل فی گھنٹہ کر دی جائے۔

یو این اور ریڈیو

ہم کامیابی کی جھیل کی نیلا ہٹوں سے بول رہے ہیں اور دنیا کو یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ ہم نے ڈنکھل کا موقع ہی نہیں آنے دیا اور روس اور امریکا کی ایٹمی طاقتوں کو برابر چھڑا دیا ہے۔ وہ دو ایٹم بم جو طرفین نے نمونے کے طور پر ایک دوسرے کو بھیجے اور واپس کیے تھے۔ ابھی تک فضاؤں کو چیر رہے ہیں۔ لیکن سیکورٹی کونسل کی غفارش پر خیر۔ گالی کے اشارے کے طور پر دونوں طاقتیں ان بموں کا رخ کسی اور طرف پھیر دیں گی۔

اے آئی ریڈیو

آج بھور سے پچھتم سی ایک بہت بڑا بمیا نک پونچھ والا اتارا آکاش پر کلا اور آن کی آن میں ہمارے سروں پر آکر لٹک گیا۔ جتنا میں اس کارن بہت ڈراور بے اپن ہو گیا ہے۔

اے پی ریڈیو

مدارس سيارہ جس کے طلوع ہونے کی خبر اس سے پیشتر نشر کی جا چکی ہے۔ فضاؤں میں اسی طرح معلق ہے۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ یہ آہستہ آہستہ زمین کی طرف آرہا ہے۔ حکومت نے اس کے بارے میں معتبر رپورٹ تیار کرانے کے لیے سکولوں کے تمام ہوشیار سائنس ماسٹروں اور کالجوں کے تمام اائق پروفیسروں کی ایک جماعت تیار کی ہے امید ہے کہ بہت جلد اس مدار سيارے کی وجہ نمود معلوم ہو جائے گا۔

اے آئی ریڈیو

آکاش پر پونچھ والے تارے کے پگٹ ہونے سے جتنا میں بھے اور بھی ادھک ہو گیا ہے۔ پرتو بھارت سرکار کے رکھشا منتری نے جتنا کواشو اسن دایا ہے کہ اس بھی نگر گرہ کو مارنے کی یو جنانیں سوچی جارہی ہیں بڑے بڑے پنڈتوں اور اچار یوں کو اس کٹھنائی کا بھید جاننے پر لگا دیا گیا ہے۔

اے پی ریڈیو

سکول کے ماسٹروں اور کالج کے پروفیسروں نے سائنس کی ساری کتابیں چھان ماری ہیں مگر انہیں اس مدار ستارے کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ جواب

زمین کی طرف پہلے کی بہ نسبت اور زیادہ سست رفتاری سے نیچے اتر رہا ہے۔ علماء دین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ سیارہ قہر خدا ہے جو ہم پر نازل کیا ہے۔ چنانچہ عوام سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اس بلا کو نالنے کے لیے خدائے عزوجل ہی سے رجوع کریں۔ طے پایا ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے بڑے بڑے میدانوں میں لوگ جمع ہوں اور نئے سرہ نما لگیں۔

اے آنی ریڈیو

جن پنڈتوں اور اچار یوں کو پونچھ والے ستارے کے بھید کی کھوج پر لگا دیا گیا تھا۔ اس پری نام پر پہنچے ہیں کہ مانو و گیان اس ستارے کے رس کو جاننے میں اس مرتبہ ہے۔ پراچین رشیوں کی نمتی کے انوسار بھارت سرکار نے یہ نپے کیا ہے کہ کورو گھشتر کے اتہاسک میدان میں ایک مہان یگ رچایا جائے۔ اس یگ میں ویدوں کے دھرمند رپنڈت تھادووان سملت ہوں گے۔ ایک مہان ہون کے لیے ساگر کی اکٹھی کی جارہی ہے۔ میسور کے سارے چندن کے بن کٹوا کر یگ استھان پر لائے جارہے ہیں۔ ایک وانی ویر نے ایک اکھٹین شدھ گھی کے پرتی دن دینے کا پرن کیا ہے۔ سادھوؤں تھایا تریوں کے بھو جن آدی پر دس کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ پورن آشا ہے کہ مہار پھو پر میثور کی اپا دیا سے یہ کٹھن گھڑی مل جائے گی۔

اے پی ریڈیو

میدانوں میں نئے سرے اجتماعی دعائیں مانگنے، دس کروڑ کالے بکروں کی قربانی دینے اور تمام اولیاء کرام کے مزاروں پر نذر و نیاز اور چادریں چڑھانے کے ساتھ ساتھ حفظ مآلہم کے طور پر زمین میں جگہ جگہ سرنگیں اور گڑھے کھودنے کا کام بھی جاری ہے۔ اگر خدا نخواستہ دمدار سیارہ نیچے آ رہا تو یہ سرنگیں اور گڑھے خاطر خواہ بچاؤ کی صورت پیدا کر دیں گے۔

اے آنی ریڈیو

مہمان یک پھلنا پور روک ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بھارت سرکار کے رکشہ منتری نے جتنا کہ بچاؤ کے لیے بیس کروڑ آدمیوں کی ایک بھاری سینا کو ایک سرنگ کھودنے پر لگا دیا ہے جو پاتال تک جائے گی۔ اوٹکنا پڑنے پر یہ سرنگ سب زنا ریوں کے لیے رکشہ استھان کا کام دے گی۔

ایس ایچ ریڈیو

ہم ساتویں آسمان سے بول رہے ہیں۔ پستیوں سے اطلاع وصول ہوتی ہے کہ وہاں دو بستیوں میں بڑے خضوع و خشوع سے دعائیں مانگی جا رہی ہیں کہ خدا ان کو انسان کے اپنے بنائے ہوئے تباہ کن بموں سے نجات دلائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ذات رحیم و کریم ہے اور اس کے حضور صدق دل سے مانگی ہوئی دعا کبھی خالی نہیں جاتی لیکن پستیوں کی ان دو بستیوں کے باشندوں کے

ایمان و ایتقان کی پختگی کا یہ عالم ہے کہ حفاظت کے لیے ایک ہاتھ دعا کے لیے
آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے زمین میں گڑھے اور سرائیں
کھودتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

پردے کی باتیں

پردہ اٹھتا ہے:

بازار میں ایک آدمی سٹول پر کھڑا ہے منہ سے بھونپو لگائے اور ہاتھ میں بہت بڑی قینچی پکڑے چلا رہا ہے ”اگر میں نے کسی مسلمان عورت کو اس بازار میں بے پردہ گزرتے دیکھا تو اس قینچی سے اس کی چٹیا کاٹ دوں گا۔“

درزی کی دکان میں ادھڑ ادھڑ برقعے سے جا رہے ہیں۔ کام کے ساتھ ساتھ باتیں بھی جاری ہیں۔ ”یار جناح صاحب کی مشیرہ کیوں نہیں پردہ کرتیں؟“
”معلوم نہیں“

”وزیراعظم صاحب کی بیگم صلابہ بھی ہیں وہ بھی ننگے منہ پھرتی ہیں۔“
”امیر آدمیوں کو پردے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“
”کسی مولودی سے پوچھنا چاہیے۔“

کالج میں مباحثہ ہو رہا ہے۔

لڑکی جذبات بری آواز میں کہتی ہے ”صرف عورتوں کے حقوق دبانے کی خاطر اور انہیں معاشرتی سرگرمیوں سے دور رکھنے کے لیے مردان پر پردہ عائد کرنا چاہتے ہیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے مسلمان عورتیں

مردوں کے دوش بدوش جنگ میں حصہ لیتی رہی ہیں۔۔۔۔۔ پردہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ بہت بڑا ظلم ہے، وہ لوگ جو اس کے حامی ہیں۔ ان کو چاہیے کہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں۔ پچاس ہزار عورتیں مشرقی پنجاب میں رہ گئی ہیں کیا ان کی تباہی کا باعث یہ زبردستی حائد کیا ہوا پردہ نہیں ہے۔“

لڑکا میز پر مکہ مار کر کہتا ہے ”خدا کی قسم! میں پردے کا باکل حامی نہیں میں چاہتا ہوں کہ یہ اعنت حرف غلط کی طرح مٹ جائے لیکن صرف بحث کی خاطر مجھے بڑے زور سے کہنا پڑتا ہے کہ پردہ عورت کے لیے اشد ضروری ہے۔ اگر عورتیں بے پردہ چلیں پھریں گی تو نظام معاشرت باکل درہم برہم ہو جائے گا۔ فاسد خیالات کا دور دورہ ہوگا اور مرد باکل حیوان بن جائیں گے۔ عورتوں کو صرف اسی خوف سے کہ مرد کہیں حیوان بن جائیں فوراً پردہ اختیار کر لینا چاہیے۔“

گلی میں چھوٹے چھوٹے بچے اور چھوٹی چھوٹی بچیاں کھیل رہی ہیں۔ ایک بچہ دغنا ایک بچی سے کہتا ہے ”تمہیں شرم نہیں آتی، نگلی پھر رہی ہو، جاؤ برقع پہن کر آؤ۔“

بچی جواب دیتی ہے ”میں برقع نہیں پہنتی لیکن تم ننھے پاؤں کیوں پھرتے ہو؟“

کافی ہاؤس میں ایک لمبے بالوں والا آدمی اپنے دوستوں سے کہہ رہا ہے ”پردہ الایعنی ہے پردہ ہوتا ہے جہالت کا، پردہ ہوتا ہے غفلت کا، راز کا، گمنامی

کا۔۔۔ عورت جہالت نہیں، غفلت نہیں، راز نہیں، گمنامی نہیں۔۔۔۔۔ پھر اس کا پردہ کیا؟“

بھڑیا خانے میں ایک داڑھی والا سامعین سے کہہ رہا ہے:

”جکم بھینہ امر تو یہی ہے کہ عورت اپنی زینت چھپائے۔ استثنیٰ بھینہ امر نہیں ہے کہ فلاں حصہ جسم کا چھپایا جائے۔ استثنیٰ کے الفاظ ہیں ”الاما طھر منها“ صرف اس بات کا ہے کہ اگر زینت کا کوئی جزو اتفاق طور پر یا مجبوری سے ظاہر ہو جائے گا تو اس پر گرفت نہیں۔ اگر جسم یا آرائش کے کسی خاص حصے کو ظاہر کرنا عام طور پر جائز کرنا مقصود ہوتا تو آیت میں کہا جاتا کہ اپنی زینت کو چھپاؤ، بجز فلاں فلاں چیز کے۔۔۔۔۔ ”الاما طھر منها“ سے یہ مراد لینا کہ منہ اور ہاتھ کھلے رکھے جائیں صحیح نہیں۔ اس لیے کہ غیر ارادی طور پر اس سے بھی زیادہ حصہ جسم کا ظاہر ہو جانا قابل گرفت نہ ہوگا اور مجبوری نہ ہو تو سارے جسم کو چھپانا عورت کے لیے ضروری ہے۔“

دیہات میں ایک جاٹ اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے ”نیک بنختے! یہ بہ چہرہ چھوڑ
برخانرڈا۔ او جیہڑ اتنبووا نگ ہندا اے“

ایک آدمی اپنے خواندہ دوست سے خط لکھوا رہا ہے:

”جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!“

الحمد للہ! پاکستان قائم ہو چکا ہے اور شریعت اسلامی نافذ ہو چکی ہے جو تھیکا رائے کا یہ گانا ”گھونگھٹ کے پٹ کھول تو رے پیالیں گے“ فوراً ضبط ہونا چاہیے کہ یہ پردہ دار عورتوں کو برکانے کا موجب ہو سکتا ہے۔

ٹی باؤس میں ایک ترقی پسند کہہ رہا ہے ”پردے کے مسئلے پر گفتگو کرنے سے پہلے ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ستر پوشی کا خیال پہلے باوا آدم کے دل میں پیدا ہوا یا اماں حوا کے دل میں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ شروع شروع میں دونوں اس سے ناقل تھے لیکن جب ہانیل اور قانیل پیدا ہوئے تو باوا آدم کو اپنی بیوی کی ستر پوشی کا خیال آیا۔۔۔۔۔ اور انسان کا سب سے پہلا لباس انجیر کے پتوں سے تیار ہوا۔۔۔۔۔ اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ عورت کے کس حصہ جسم کی ستر پوشی آدم نے سب سے پہلے ضروری سمجھی۔۔۔۔۔“

بازار میں ڈھنڈو راپٹ رہا ہے آج شام کو چھ بجے منٹو پارک میں جس کا اسلامی نام باغ عدن رکھا گیا ہے۔ مولانا گل داؤدی کے زیر صدارت ایک عظیم الشان جلسہ ہو گا۔ جس میں بیگم لیاقت علی خان کے اس بیان کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہو گی جو انہوں نے بے پردگی کی حمایت میں دیا ہے۔

مال روڈ پر فٹ پاتھ کے ساتھ گھاس کی روش پر ایک آدمی آلتی پاتنی مارے

بیٹھا ہوا ہے اور اپنے دوستوں سے کہہ رہا ہے۔

”پردہ کرنے والی عورتوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو ان کی ہے جو صرف اپنے رشتہ داروں سے پردہ کرتی ہیں، نامحرم مردوں سے انہیں کوئی حجاب محسوس نہیں ہوتا۔ ایک قسم ان کی بھی ہے جن کا پردہ اپنی گلی کے مردوں تک محدود ہے۔ سارے شہر میں پردہ در بغل یا پردہ بدوش پھرتی رہیں گی لیکن گلی میں داخل ہوتے ہی پردہ پوش ہو جائیں گی لیکن خطرناک قسم ان عورتوں کی ہے جو پردہ کرتی ہیں لیکن در پردہ پردہ نہیں کرتیں۔“

گھر میں ایک بزرگ اپنی اولاد سے مخاطب ہیں ”اس وقت ہندوستان میں میرا مطلب ہے پاکستان میں، دو لگائیں بہت عام ہیں۔ بے پردگی اور ترقی پسندی۔ دونوں کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے بے پردگی سے بے حیائی پیدا ہوتی ہے اور ترقی پسندی سے خُش نگاری“

سڑک پر ایک آدمی اخبار پڑھ رہا ہے۔

”الماہور کے ایک مجسٹریٹ نے آج ایک آوارہ نوجوان کو جس کا نام اسلم ہے دفعہ 109 کے ماتحت دو ماہ قید سخت کی مراد دی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ملزم برقع پہن کر میکوڈ روڈ پر چہل قدمی کر رہا تھا۔“

تاگہ میں ایک برقع پوش لڑکی اپنی برقع پوش سہیلی سے کہتی ہے ”آج ہمیں

سائنس ماسٹر نے بتایا کہ سیاہ چیزیں حرارت کو بہت زیادہ کھینچتی ہیں۔ پھر یہ کالے برقعے کیوں پہنے جاتے ہیں۔“

کلاس میں استاد لڑکوں سے پوچھتا ہے ”پردے کا سب سے بڑا حامی کون ہے؟“

ایک لڑکا جواب دیتا ہے وہ شاعر جس نے یہ شعر کہا

مری لحد پہ کوئی پردہ پوش آتا ہے
چراغِ گورِ غریباں صبا بجھا دینا

استاد: شاباش!-----پردے کے خلاف کون کون سے شاعر تھے؟

لڑکا: تبھی تھے لیکن ان میں غالب مشہور ہے کہتا ہے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا کبھی

کلب میں شغل مے نوشی جاری ہے۔ ایک خوش پوش نوجوان چپک رہا ہے۔
نہیں نہیں پردہ ضرور ہونا چاہیے اور برقعے سفید نہیں کالے ہونے چاہیے۔ نئے
فیشن کے۔۔۔۔۔گورے گورے ہاتھ مہین نقاب تھامے ہوں۔ کبھی ہوا کے
جھونکے سے یہ حریری پردہ لرز کر تھوڑا سا اڑ جائے۔۔۔۔۔بس دیکھا کرے
کوئی۔۔۔۔۔خدا جنت میں سب سے اونچا مقام دے اس برقعے کے موجد
کو۔۔۔۔۔کبھی کان کا جھمکا جھلک دکھا جاتا ہے، کبھی آم کی کیری ایسی

پوش بنانے کی گارنٹی دی جاتی ہے۔ آزمائش شرط ہے فیس بالکل واجبہ ہے دوران
تعلیم میں برقعہ سکول مفت مہیا کرے گا۔

پردہ گرتا ہے

☆☆☆☆☆

ٹیولنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے منہ سے کچھ اس قسم کا کلمہ نکلتا ہے ”اعت“ یا ”حد ہو گئی“، آپ ضرور اپڑچھیں گے ”کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں صاحب! سگریٹ کا ڈبہ مانگے میں رہ گیا ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ فی الحال یہ شوق فرمائیے“

اور دیر تک وہ آپ کے سگریٹوں سے شوق فرماتا رہے گا۔

تیسری قسم

زید آپ کا دوست ہے لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ وہ مفت نوش ہے ہر روز وہ آپ کے کاندھے پر باتھ رکھتا ہے اور بڑے پر تکلف انداز میں کہتا ہے ”لاؤ بھئی اب سنگریٹ پیادو“

چوتھی قسم

آپ کسی باغ میں بیچ پر بیٹھے ہیں۔ آپ کے ساتھ ہی ایک اور صاحب بیٹھے کتاب کے مطالعے میں مصروف ہیں۔ آپ جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالتے ہیں۔ آپ کے پاس بیٹھے ہوئے صاحب مفت نوش ہیں، فوراً جیب سے دیا سامانی نکالیں گے اور جا کر آپ کی طرف بڑھا دیں گے۔ آپ ان کا شکریہ ادا کریں گے اور سگریٹ کی ڈبیہ ان کی طرف بڑھا دیں گے۔

”شوق فرمائیے“

ذرا جارحانہ قسم کی ہے آپ اپنے دوستوں کے ساتھ وائی ایم سی اے ہال کے بائرنٹ پاتھ پر کھڑے ہیں۔ سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر انگلیوں میں تھامتے ہیں۔ دیا سائی ساگانے بی کو ہیں کہ ایک راہ چتا جلدی سے آپ کے پاس آتا ہے انگلیوں میں سے سگریٹ نکال لیتا ہے۔ دیا سائی طلب کرتا ہے اور سگریٹ ساگا کر یہ جاوہ جا۔ آپ سمجھتے ہیں، پاگل تھا، چنانچہ دیر تک یہ عجیب و غریب حادثہ آپ کے اور آپ کے دوستوں کا موضوعِ سخن بنا رہتا ہے۔

آٹھویں قسم

بڑی ڈھیٹ قسم ہے آپ تنگ آ کر کہتے ہیں ”بھئی اپنی جیب سے کیوں نہیں پیتے؟“

جواب ملتا ہے ”میں قسم کھا چکا ہوں کہ اپنی جیب سے کبھی ایک سگریٹ بھی نہیں خریدوں گا مفت کے مال کا کچھ اور ہی مزا ہے“

نویں قسم

آٹھویں قسم سے کچھ مختلف ہے آپ تنگ آ کر پوچھتے ہیں ”بھئی تم اپنی جیب سے کیوں نہیں پیتے؟“

جواب ملے گا ”ڈاکٹر نے مجھ سے کہا ہے کہ سگریٹ میرے لیے بہت ہی مضر ہے۔ اپنی جیب میں سگریٹ پڑے ہوں تو مجھ سے کنٹرول نہیں ہوتا اس لیے کبھی

تیرہویں قسم

وہ ہے جو ٹوڑی دیر آپ سے باتیں کریں گے اور رخصت ہوتے وقت زمین پر سے آپ کا پھینکا ہوا پیکٹ یہ کہہ کراٹھالیں گے ”بچے کے لیے لے جاتا ہوں اسے خالی ڈبیوں سے کھیلنے کا بہت شوق ہے۔“

☆☆☆☆☆

پٹانے

ایک خبر

پاکستان میں بچوں کو آتش بازی کی اعنت سے بچانے کے لیے حال ہی میں ایک انجمن قائم ہوئی ہے جس کا نام ’انجمن انسداد پٹانہ جات‘ ہے اس کا صدر دفتر بارود خانہ میں قائم کیا ہے امید کی جاتی ہے کہ بہت جلد اس کی شاخیں روس، امریکہ اور انگلستان میں بھی قائم کر دی جائیں گی۔

دوسری خبر

اس سال آتش بازی سے جل کر مرنے والے بچوں کی تعداد پچھلے سال سے دو گنا بتائی جاتی ہے۔ پاکستانی والدین نے اس پر بہت تشویش کا اظہار کیا ہے اور حکومت سے درخواست کی ہے کہ وہ آتش بازی سے جل کر مرنے والے بچوں کی ایک سالانہ تعداد مقرر کر دے۔ حکومت سے اسی سلسلے میں چنانچہ ایک نئی وزارت قائم کرنے کی استدعا بھی کی گئی ہے اس وزارت کا عہدہ سنبھالنے والے وزیر پٹانہ کہا جائیں گے۔ سنا ہے کہ مشرقی پنجاب کے دو بہت بڑے مہاجر آتش بازوں میں یہ وزارت حاصل کرنے کے لیے جوڑو لڑہوں گے۔

ایک مکالمہ

ایک باپ: آتش بازی چلانا ٹھیک نہیں
ایک بچہ: کیوں؟
باپ: پیشہ ضائع ہوتا ہے
بچہ: اتنی بڑی بڑی لڑائیاں لڑی جاتی ہیں کیا ان میں پیشہ ضائع نہیں ہوتا

دوسرا مکالمہ

ایک بچہ: میں آتش بازی نہیں چلاؤں گا
ایک باپ: کیوں؟
بچہ: میں بہت بر خوردار ہوں
باپ: کیا کہا؟ چلو ڈاکٹر کے پاس، ضرورتاً تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

ایک سبق

سردیوں میں مولیٰ نہ کھاؤ اور عید شب رات پر آتش بازی نہ چلاؤ۔

دوسرا سبق

گرمیوں میں مولیٰ کھاؤ اور عید شب رات چھوڑ کر ہر روز آتش بازی چلاؤ۔

ایک تحقیق

نفیات کے ماہرین بڑی تحقیق و تدقیق کے بعد اس فیصلے پر پہنچے ہیں کہ خوشی کا پر جوش مظاہرہ کرنے کے لیے پٹاخے چھوڑنا اور آتش بازی چلانا انسان کی جبات ہے۔ بیس ہزار سال قبل از مسیح کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلا پٹاخہ ایک انسان کی کھوپڑی کا چلایا گیا تھا لیکن آہستہ آہستہ جب لوگوں کو احساس ہوا کہ ایسا پٹاخہ چلانے سے ایک انسان کم ہو جاتا ہے تو دوسرے پٹاخے ایجاد ہونے شروع ہوئے۔

دوسری تحقیق

نفیات کے ماہرین تحقیق و تدقیس کے بعد اس فیصلے پر پہنچے ہیں کہ شروع شروع میں انسان نے درندوں کو ڈرانے کے لیے پٹاخے اور آتش بازیاں ایجاد کی تھیں لیکن بعد میں جب انسان درندوں کا بھیس بدلنے لگا تو یہ پٹاخے اور آتش بازیاں گولوں اور بموں کی شکل اختیار کر گئیں۔

ایک فرمائش

ایک بچہ: اباجی! مجھے یہ پٹاخہ نہیں چاہیے
ایک باپ: کیوں؟

بچہ: بڑے زور سے پھٹا ہے میں ڈر جاتا ہوں، کوئی ایسا پٹا خد لا دیجئے جو زور سے نہ پھٹے۔

دوسری فرمائش

ایک بچہ: اباجی! ایٹم بم کیا ہوتا ہے؟
ایک باپ: دنیا کا سب سے بڑا پٹا خد
بچہ: مجھے ایک لاد دیجئے شبِ برات پر چلاؤں گا

ایک سایہ

ایک آدمی اپنے کم سن بچے کو ساتھ لے کر ایک فقیر کے پاس گیا اور کہنے لگا ”
پیر و مرشد میں شاہِ عالمی کے پاس رہتا ہوں یہ میرا بچہ ہے خدا معلوم اسے کیا وہ گیا
ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جنات کا سایہ ہے پٹا خد کی آواز سن کر ہی اس پر تشنگی کے
دورے پڑنے لگتے ہیں۔“

دوسرا سایہ

ایک آدمی اپنے کم سن بچے کو ساتھ لے کر ایک فقیر کے پاس گیا اور کہنے لگا ”
پیر و مرشد۔۔۔۔۔ میں مہاجر ہوں امرتسر سے آیا ہوں۔ میرے اس بچے کے لیے
کوئی تعویذ دیجئے۔ جب بھی اسے موقع ملتا ہے۔ ادھر ادھر سے چیزیں اکٹھی کرتا

ہے اور انہیں آگ لگا دیتا ہے۔“

پہلی پھلجڑی

ایک بچہ: انا رکلی میں ایک لڑکی جا رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر ایک آدمی نے اپنے دوست سے کہا ”با اکل پٹا نہ ہے“

دوسرا بچہ: کیا وہ چلا؟

پہلا بچہ: ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس لڑکی نے جو تاتا را اور پٹا خ سے اس آدمی کے سر جڑ دیا۔

دوسری پھلجڑی

ایک بچہ: آتش بازی چلانے سے ہمیں کیوں منع کیا جاتا ہے؟

دوسرا بچہ: اگے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

پہلا بچہ: گدھے کہیں کے ریڈیو پر، اخباروں میں، تقریروں میں ہر روز یہی کہو اس کرتے ہیں کہ بچوں کو آتش بازی کی لعنت سے دور رکھا جائے لیکن دکانیں بھری ہوئی ہیں آتش بازیوں سے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیوں نہیں ایسا کرتے کہ آتش بازی بنانا ہی بند کر دیں۔

دوسرا بچہ: شش شش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کوئی سن لے گا۔

☆☆☆☆☆☆

کارل مارکس

آں کلیم بے جلی آں مسیح بے صلیب
نیمست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب
(اقبال)

تمام دنیا کی نگاہیں آج کل روس پر جمی رہتی ہیں۔ آج سے پہلے بھی جمی رہتی تھیں مگر ان نگاہوں میں تمسخر کی ایک جھلک تھی۔ ایک قسم کا استہزا تھا۔ یورپ میں سیاست کی ٹیڑھی ٹوپی پہننے والے بانکے، روس کے مزدوروں کی جدوجہد دیکھتے تھے اور زیر لب مسکراتے تھے۔۔۔۔۔ روس میں صدیوں کے غلاموں نے جب اپنی زنجیروں کا لوہا گلا گلا کر ایک نئی سلطنت کی بنیادوں کو پالنا شروع کیا تو آزاد قوموں نے کئی بار ان کا منہ کھلایا۔۔۔ اپنا گھر درست کرنے کے لیے جب ان لوگوں نے گرم جوشی کا اظہار کیا تو بنے بنائے اور بے حجائے گھروں میں رہنے والے کھلکھا کر ہنستے رہے۔ وہ کوشش جو کبھی دیوانگی پر متحول کی جاتی تھی۔ وہ مٹی جو کبھی ناممکن اور بے بشریت کی جاتی تھی۔۔۔۔۔ وہ سلطنت جو کبھی مزدوروں کا ایک خیال خام سمجھی جاتی تھی۔ معرض وجود میں آئی۔۔۔۔۔ سیاست کی ٹیڑھی ٹوپی پہننے والوں، مذہب کا لمبا جبہ زیب تن کرنے والوں، آزاد اور غلام قوموں شکستہ جھونپڑوں اور مرمری محلوں میں رہنے والوں نے دیکھا۔۔۔۔۔ وہ مجزرہ اپنی آنکھوں سے دیکھا جس کو ”سوویٹ روس“ کہتے ہیں۔

سوویٹ روس اب خواب نہیں خیال خام نہیں دیوانہ پن نہیں۔۔۔۔۔ ایک

ٹھوس حقیقت ہے۔۔۔۔۔ وہ ٹھوس حقیقت جو ٹکڑے ٹکڑے کے فواد دی ارادوں سے کئی ہزار میل لمبے جنگلی میدانوں میں ٹکرانی اور جس نے فاشیت۔۔۔۔۔ آبن پوٹش فاشیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔۔۔۔۔ وہ اشتراکیت جو کبھی سر پھرے لوٹندوں کا کھیل سمجھا جاتا تھا۔ وہ اشتراکیت جو کبھی دل بہاؤ کے کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔۔۔۔۔ وہی اشتراکیت جو جنگ دین اور رنگ انسانیت یقین کی جاتی تھی۔ آج روس کی وسیع و عریض میدانوں میں بیمار انسانیت کے لیے امید کی ایک کرن بن کر چمک رہی ہے۔ یہ وہی اشتراکیت ہے جس کا نقشہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے کارل مارکس نے تیار کیا۔۔۔۔۔ قابل احترام ہے یہ انسان جس نے اپنی ذات کے لیے نہیں، اپنی قوم کے لیے نہیں، اپنے ملک کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے، ساری انسانیت کے لیے، مساوات اور اخوت کا ایک ذریعہ تلاش کیا۔

جس طرح کچھڑ میں کنول پیدا ہوتا ہے اسی طرح سرمایہ پرست یہودیوں کے ایک گھرانے میں سرمایہ شکن کارل مارکس پیدا ہوا۔۔۔۔۔ پانچ منی سن اٹھارہ سو اٹھارہ کو۔۔۔۔۔ ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کے متعلق باپ نے یہ رائے قائم کی کہ یہ بڑا ہو کر شیطان نکلے گا۔۔۔۔۔ کارل مارکس بڑا ہو کر شیطان کا ایسا فرشتہ اس کا کچھ اندازہ تو ہماری موجودہ نسلیں کر چکی ہیں قطعی فیصلہ آنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہے۔۔۔۔۔ اس مختصر فہرچر میں جواب آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ ہم اس شیطان یا فرشتے کے مختصر سوانح حیات نیم سوانح حیات نیم ڈرامائی شکل میں پیش کریں گے۔

باپ: خدا ہمارے حال پر رحم کرے۔۔۔۔۔ تمہارے اس لڑکے نے میرا

نام میں دم کر رکھا ہے۔

ماں: جیسا میرا ہے ویسا آپ کا ہے یہ آپ ہر وقت مجھے ہی کیوں طعنے دیتے رہتے ہیں۔

باپ: بھئی! میں بڑا پریشان ہو گیا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔۔۔۔۔ غبی ہوتا، کند ذہن ہوتا تو میں خاموش ہو کے بیٹھ جاتا مگر کم بخت ذہین ہے۔۔۔۔۔ بابا کا ذہین ہے۔ چاہے تو سب کچھ سیکھ سکتا ہے۔
ماں: مگر اس کا دل بھی کسی طرف لگے؟

باپ: اسی بات کا تو رونا ہے سکول میں بھی اس کے یہی چلن تھے۔ اب کان لچ میں داخل ہو کر تو اور بھی زیادہ آوارہ گرد ہو گیا ہے۔ تعلیم کی طرف دھیان ہی نہیں دیتا۔ بڑی بے فکری اور بے پرواہی سے یہ زمانہ جو اس کی زندگی میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے، گزار رہا ہے۔ ہزار بار سمجھا چکا ہوں مگر صاحبزادے کے کان پر جوں تک نہیں رہتی۔۔۔۔۔ وہ خاص مضمون یعنی قانون جو میں نے اس کے لیے منتخب کیا تھا۔ اس کی طرف سنتا ہوں، کچھ توجہ ہی نہیں دیتا۔ میں اس کا یہ ابا بالی پن کب تک برداشت کرتا رہوں گا۔ صبر کی ایک حد ہوتی ہے

ماں: تازہ دھڑ میں اس نے آپ کو کیا لکھا ہے؟

باپ: (تمسخر کے ساتھ) ذہنی الجھنوں اور روحانی پریشانیوں کے باعث آپ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اس لیے کچھ دن ہسپتال میں رہے۔ وہاں سے واپس آ کر بھی جب آپ کی روحانی کشمکش ختم نہ ہوئی تو مجھے لکھتے ہیں ”ابا جی! میرے ذہن میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ اس انقلاب کی پوری

تفصیل حاضر خدمت ہو کر جی عرض کر سکتا ہوں۔ اجازت عنایت ہوتا کہ میں اپنی روح کا 'بوجھ ہا کا کر سکوں'۔۔۔۔۔۔ یہ لکھا ہے آپ نے۔۔۔۔۔۔ (ہنستا ہے) اپنی روح کا 'بوجھ ہا کا کرنے کے لیے برخوردار یہاں آنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے اجازت مانگتے ہیں۔

ماں: یہ روح کا بوجھ کیا ہو سکتا ہے؟

باپ: کوئی نیا عشق لڑایا ہو گیا آپ نے یا وہی پرانا ہوگا اور ہسپتال میں جا کر عود کر آیا ہوگا۔

ماں: سچ مچ یہ اس کو کیا خبط سمایا جو اس جینی سے عمر میں اس سے چار سال بڑی ہے۔ شادی کرنے پر تلا ہوا ہے۔

باپ: اسی کو تو روحانی بیماری کہتے ہیں چونکہ اس کا علاج ہسپتال میں نہیں ہو سکا۔ اس لیے یہاں تشریف لانا چاہتے ہیں جیسے میں اجازت دے دوں گا کہ جاؤ میاں اپنے سے دینی عمر کی لڑکی سے شادی کرلو۔

ماں: مگر آپ تو اسے جینی سے شادی کرنے کی اجازت دے چکے ہیں

باپ: یہ جھک میں نے صرف اس لیے ماری تھی کہ وہ جینی سے خط و کتاب کرنے میں اپنا وقت ضائع نہ کرے۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اس نے کالج کا پہلا سال شعر و شاعری میں گزارا ہے۔ تین کاپیوں میں ڈیڑھ ہزار شعر و کچھ چکا ہوں جو اس نے اس ماسٹرنی جینی کے نام سے منسوب کیے ہیں۔ میں نے اس کو اجازت دی تھی تاکہ یہ عشقیہ شعر و شاعری اور خط و کتاب کا خاتمہ ہو جائے مگر اب میں سمجھتا ہوں کہ وہ نئی مراعات چاہتا ہے۔

گئے۔ والد کی وفات کے بعد مارکس کی تعلیم بصد خرابی جاری رہی۔ آخر کار ایک فلمیہ نہ مضمون لکھنے پر اسے ”جینا یونیورسٹی“ سے پی ایچ ڈی کی سند مل گئی۔ چونکہ مارکس کے عقیدے کے بموجب علم و عمل ایک ہی شے کے دوزخ تھے۔ اس لیے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اس نے فوراً سیاسی میدان میں جدوجہد شروع کر دی۔ زیٹا نگ نامی ایک اخبار کا مدیر بنا اور حکومت کی پالیسی پر اس شدت سے تنقید کی کہ اخبار ضبط کر لیا گیا۔

مارکس: روگی! میرے دوست ضابطی کے اس حکم پر مجھے قطعاً تعجب نہیں ہوا
 افسوس بھی کچھ زیادہ نہیں ہوا
 روگی: کیوں؟

مارکس: ضابطی کا حکم اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ عوام میں سیاسی بیداری بڑھ رہی ہے۔ جب کسی قوم میں سیاسی بیداری کے آثار پیدا ہونے لگیں تو تحریر و تقریر پر اسی طرح پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے ”زیٹا نگ“ بند ہونے پر سنسرافسر نے کیا لکھا تھا؟
 روگی: کیا لکھا تھا؟

مارکس: میں خوش ہوں کہ مارکس کے دست بردار ہو جانے کا یہ اثر ہوا ہے کہ آج میں نے اپنا تمام کام ایک چوتھائی وقت میں ختم کر لیا۔
 روگی: تم نے ادارت سے استعفیٰ کیوں دیا؟

مارکس: اور کیا کرتا بھائی ایسے ماحول میں جہاں قدم قدم پر غلامی ہو مجھ سے کام نہیں ہوتا۔ میرا دل گھٹنے لگتا ہے آزادی کے لیے سونیوں سے لڑنا مجھے پسند

نہیں۔ میں حاکمِ حق کی بے رحمی اور بے وقوفی اور اپنے ہم عصروں کی جی حضوری چاہوں ہی بہانہ سازی اور بے کار کے بحث مباحثے سے تنگ آ گیا ہوں جرئت میں رہ کر میں کچھ نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ خدا کی قسم! کچھ نہیں کر سکتا، اس ملک میں رہنا اپنی توہین ہے، ذلت ہے۔

روگی: تو اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟

مارکس: سوچ رہا ہوں کہ کوئی رستہ نکل آئے آج کل مفت کی پریشانی اور خواہ مخواہ کی بھینٹوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ ادھر میرے کنبے والے بے کار میری شادی کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔ کوئی انہیں سمجھائے تو کیسے سمجھائے؟۔۔۔۔۔ عشقیہ جذبات برطرف میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اپنی ہونے والی بیوی سے بے پناہ محبت ہے آج منگنی ہوئے سات برس ہو چکے ہیں۔ وہ بے چاری اپنے اور میرے عزیزوں کو راضی کرنے کی کوشش کر رہی ہے مگر وہ ایسے خردماغ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

روگی: جینی کے رشتہ دار اس شادی کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟

مارکس: تم یہ بھی نہیں سمجھتے بھائی! وہ لوگ برلن کی حکومت کی اسی قدر عزت کرتے ہیں جتنی اپنے آسمانی باپ کی اور میں حکومت کا بیری بہت بڑا دشمن ٹھہرا اس ڈٹوئنگ کار ہے میرے عزیز تو وہ بھی اپنے انفرادی مفاد کے پیش نظر اس رشتے کے خلاف ہیں۔ کئی برسوں سے میں اور جینی اس شادی کے معاملے میں اپنے سے کتنی عمر والوں سے بحث کر رہے ہیں لیکن بدھتوں کی اس دلیل کا کیا کیا جائے جو وہ ہر بات میں سامنے لے آتے ہیں

”یہ ہماری زندگی کا تجربہ ہے جب تم ہماری عمر کو پہنچو گے، اس وقت سمجھو گے“
اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ان کی عمر تک پہنچ کر جینی سے شادی کروں۔

روگی: میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے ایک اخبار جاری کروں۔ اگر یہ سکیم
پوری ہوگئی تو میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری بہت سی مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا

مارکس کے دوست روگی کی سکیم نے عملی جامہ پہن لیا اس نے ایک اور اخبار
نکاالا اور مارکس کو پانسو تحویلر ماہانہ پر اس کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ فکر معاش سے آزادی
ہوئی تو مارکس نے انیس جولائی اٹھارہ سو تینتالیس میں جینی سے شادی کر لی اور
پیرس چلا گیا۔ یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ مارکس نے دن گزارنے کے لیے ایک
اخبار کے ادارے میں کام کرنا شروع کر دیا یہاں اس کی ملاقات مشہور شاعر ہانسے
سے ہوئی۔ ہانسے اگرچہ جرمن تھا لیکن فرانسیسی اس کو اپنا قومی شاعر مانتے تھے
جب شاعر نے پروشا کی حکومت کے قلم و ستم کے خلاف متواتر گیارہ نظمیں شائع
کرائیں تو حکومت پروشا نے فرانس پر اثر ڈال کر اخبار کے مدیروں کے خلاف
جن میں مارکس بھی شامل تھا، جلا وطنی کا حکم صادر کر دیا۔ مارکس اپنی بیوی سمیت
بروسلز چلا گیا۔

بیوی: اب یہاں گزارے کی کیا صورت ہوگی یہ لوگ ہمیں کہیں بھی چین نہیں
لینے دیتے۔

مارکس: کچھ فکر نہ کرو اللہ میاں نے بندوبست کر دیا ہے۔۔۔۔۔ دیکھو، ابھی
میرے شفیق دوست فریڈرک اینجلز کا خط آیا ہے
بیوی: (خوش ہو کر) کیا لکھتے ہے

مارکس: (خٹ کھولتا ہے) چند جمع کر کے اس نے کچھ روپیہ بھیجا ہے معلوم نہیں
لگتا، آج یا کل مل جائے گا۔۔۔۔۔ ہاں تو خط میں لکھتا ہے۔۔۔۔۔“
معلوم نہیں یہ رقم بروسلز میں تمہارے گز ارے کے لیے کافی بھی ہوگی یا نہیں لیکن تم
کچھ فکر نہ کرو میری انگریزی تصنیف کا جو معاوضہ بھی ملے گا میں تمہیں فوراً روانہ کر
دوں گا مجھے خرچ کی مطلق ضرورت نہیں اور اگر ہونی بھی تو یہاں سے روپیہ ملتا
رہے گا دراصل میں نہیں چاہتا کہ تمہارے دشمن اس بات سے خوش ہوں کہ مالی
مشکلات سے تمہیں پریشانی ہوئی۔“

بیوی: خدا آپ کے اس مشفق دوست کو رہتی دنیا تک سلامت رکھے آپ کی کتنی خبر گیری کرتا ہے۔

مارکس: نیگم! اینجلز کو صرف میرا دوست کہنا اس کی اور میری دونوں کی توہین ہے۔ ہم دونوں ایک ہیں ہماری زندگی ایک دوسرے سے اس درجہ وابستہ ہو چکی ہے کہ ہم دونوں روحانی طور پر ایک ہو چکے ہیں اینجلز میرا اور میں اس کا ہمارا ہوں۔

نیو ی: ان سے آپ کی ملاقات شاید زیٹا لگ اخبار کے دفتر میں ہوئی تھی؟
مارکس: تم ٹھیک کہتی ہو لیکن ہماری دوستی کا آغاز اس وقت ہوا جب ایجنلر نے
اپنی کتاب لکھی اور میں نے اس کی بہت تعریف کی سچ تو یہ ہے کہ اقتصادی میدان
میں ایجنلر کی نظر بہت وسیع ہے حالانکہ وہ ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ مارکس بہ نسبت
میرے زیادہ دور۔ زیادہ گہرا اور زیادہ جلدی دیکھتا ہے۔ یہ اس کی کس نفسی ہے۔
ایجنلر اور مارکس کی زندگی واقعی ایک دوسرے سے غایت درجہ وابستہ تھی۔

باوجود انجیلز کی کسی نفسی کے یہ ماننا پڑتا ہے اور جیسا کہ خود مارکس تسلیم کرتا ہے ابتداء میں اقتصادی میدان انجیلز نے دیا اور کارل مارکس نے لیا۔ دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ خیر، برسوں اس زمانے میں بے الاقوامی بورژوائی رجحانات کا مرکز تھا اور اس لیے کمیونزم کی نشر و اشاعت کے لیے بہترین جگہ تھی۔ یہاں مارکس نے اپنا کام شروع ہی کیا تھا کہ 24 فروری 1848ء کو فرانس میں انقلاب ہو گیا بادشاہ فرانس کو جو حادثات پیش آئے۔ انہوں نے یورپ کے تاجداروں کو ڈرا دیا۔ چنانچہ جیمز کے بادشاہ کے حکم سے مارکس اور اس کی بیوی کو گرفتار کر لیا گیا۔ دوسرے دن رہائی ملی تو جلاوطنی کا حکم صادر ہو گیا۔ مارکس نے پھر پیرس کا رخ کیا اور اپنے چند انقلابی دوستوں کی مدد سے اخبار نکالا جس سے اس کی شہرت عام ہو گئی مگر اس طوفان میں یہ چراغ کب تک روشن رہ سکتا ہے۔ فوراً ہی حکومت کا تشدد شروع ہو گیا۔ اخبار کے حصہ داروں نے ڈر کے مارے مالی امداد سے انکار کر دیا لیکن ان مشکلات کے باوجود مارکس نے اخبار بند نہ کیا۔ باپ سے ترکے میں جو سات ہزار تھیلر ملے تھے۔ اس پر نمبر لگا دیئے لیکن دو چار دن ہی میں اخراج کا حکم آ گیا 19 مئی کو مارکس نے آخری انقلاب نمبر نکالا اور اخبار بند کر دیا۔

مارکس: ہمیں ستانے کے لیے حکومت یہاں کیوں ترستی ہے۔ جھوٹ اور افترا کے پل کیوں باندھتی ہے۔ ہم تو خود جلا دیں اس لیے دوسروں سے رحم کی امید نہیں رکھتے جب ہمارے دن پھریں گے تو ہم اپنے تشدد کے یہاں اور حیلے نہیں تراشیں گے۔

دوست: اخبار بند ہونا تھا، سو گیا، اب آپ کا ارادہ کیا ہے؟

مارکس: ارادہ کیا ہے۔ دماغ متل ہے ہوش و حواس قائم نہیں۔ قرض خواہوں سے چھٹکارا ملے تو کچھ سوچوں بھی مزدوروں اور فکرکوں کی تنخواہیں ادا کرتے کرتے میرا کچھ مر نکل گیا ہے۔ نیوی کے پاس کچھ زیورہ گئے تھے۔ ان کو گروی رکھ کر اتنے دن گزارہ کیا ہے۔ ایک دوست کو مالی امداد کے لیے لکھا ہے۔ اس نے چند جمع کرنا شروع کر دیا۔

دوست: تو کیا ہوا روپیہ کسی طرح تو آنا چاہیے۔

مارکس: نہیں بھائی! مجھے یہ طریقہ منظور نہیں میں ہر عسرت برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن عوام سے بھیک مانگنا کسی طرح بھی گوارا نہیں ہو سکتا۔ جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ وہ میری خاطر چندہ جمع کر رہا ہے تو خدا کی قسم! مجھے بہت دکھ ہوا میں نے فوراً لکھا کہ ایسی امداد مجھے نہیں چاہیے۔ میں نے اس سے مانگا تھا۔ دوسروں سے مانگنے کے لیے نہیں کہا تھا۔

دوست: کیا پیرس میں رہنے کا ارادہ ہے؟

مارکس: نہیں مطلق نہیں جو نہی زاد راہ کا بندوبست ہوا میں یہاں سے لندن چلا جاؤں گا

23 اگست کو مارکس نے فرانس کو الوداع کہی اور لندن چلا آیا۔ یہاں اس کے لڑکا پیدا ہوا جو مغلسی کے باعث ایک سال کے اندر اندر مر گیا۔ چاروں طرف مصائب ہی مصائب تھے لیکن ان کی موجودگی میں بھی مارکس نے اپنے علمی مشاغل جاری رکھے۔ صبح نو بجے لندن کی لائبریری میں چلا جاتا تھا اور شام کے سات بجے لوٹتا تھا۔۔۔ وہ اپنی مشہور کتاب ”اقتصادیات پر تنقید“ لکھ رہا تھا،

اس زمانے میں تقدیر کچھ مسکرائی تو ایک دوست کے توسط سے امریکہ کے ایک اخبار کی رپورٹری مل گئی اور کچھ معاوضی ملنے لگا تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مارکس تخت بیمار ہوا۔

مارکس: کسی بیماری نے مجھے اتنا کمزور نہیں کیا جتنا کہ اس نامراد بیماری نے کیا ہے مگر تمارا بچا ہوں۔

دوست: اب آپ کے حالات کیسے ہیں؟

مارکس: (مسکرا کر) حالات اب ایسی قلبی بخش منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ نہ باہر جاسکتا ہوں کیوں کہ سب کپڑے گروی پڑے ہیں۔ نہ گوشت کھاسکتا ہوں کیوں کہ جوہری آبی ساکھ تھی، وہ اس بیماری نے ختم کر دی ہے۔

دوست: چھوٹی لڑکی کا کیا حال ہے؟

مارکس: بے چاری کئی دن سے کھانسی اور بخار میں مبتلا ہے بہت کمزور ہو گئی ہے شاید ہی بچے کیوں کہ دوا دارو کے لیے ایک پیسہ بھی پاس نہیں۔

دوست: اللہ رحم کرے

مارکس: ہاں اللہ ہی رحم کرے۔۔۔۔۔ بیوی بیمار، بیٹی بیمار، لڑکے کو بخار، روپیہ پیسہ پاس نہیں نفٹ بھر سے صرف روٹی اور آلو پر گزرا کر رہا ہوں۔ شاید اب یہ بھی نہ ملے اور فاقے کرنے پڑیں۔ کاغذ خریدنے کے لیے پیسے نہیں کہ مضمون لکھ کر اخبار کو روانہ کر سکوں۔ اب صرف یہ ہونا باقی ہے کہ مالک مکان گھر سے نکال دے کیوں کہ اس کے بائیس پونڈ میری طرف نکلتے ہیں۔

دوست: اگر اس نے واقعی نکال دیا؟

مارکس: تو بہت ہی اچھا ہو گا ان بانکس پونڈوں کا بوجھ تو میرے سینے سے اترے گا۔۔۔ لیکن مالک مکان یہ عنایت مجھ پر کیوں کرنے لگا۔ روٹی والے، دودھ والے، سبزی والے، قصائی، پرچون والے، ان سب کا قرضہ الگ رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مصیبتیں کب ختم ہوں گی۔ بڑے شرم کی بات ہے مگر چند روز سے مزدوروں سے قرض لے لے کر گزارا کر رہا ہوں۔ کیا کروں، ان سے بھی نہ مانگوں تو بھوکا مر جاؤں۔

دوست: آپ ہی کی ہمت ہے کہ مشکلات کے ان جھوم میں بھی اپنا کام کئے جا رہے ہو۔

مارکس: بوڑھائی طبقہ مجھے میرے مقصد سے ہٹا کر سونا مانے کی ترغیب دینا چاہتا ہے میں ان کو بتا چکا ہوں کہ وہ مجھے کبھی سکے بنانے کی مشین میں تبدیل نہیں کر سکیں گے۔ میں ہر مصیبت میں اپنا کام کرتا رہوں گا۔

دوست: بگر روپیہ مانا بھی تو ضروری ہے

مارکس: روپیہ مانا چاہیے کہ ہم زندہ رہیں اور کچھ لکھ سکیں لیکن روپیہ مانے کے لیے ہمیں زندہ رہنا اور لکھنا ہرگز نہیں چاہیے۔

مغلسی کا یہ عام لیکن اپنے پیش نظر مقصد سے ایک لمبے کے لیے بھی مارکس کی نظر نہ ہٹی وہ ایک بندہ مومن کی طرح اعلان حق میں لگ ا رہا۔ کڑے سے کڑے امتحانوں میں سے گزر رہا پر آگروہ ثابت قدم رہا۔ اس کی جان و دل سے پیاری بچی سامنے دم توڑ رہی تھی۔ خود فاقوں سے مدد حال تھا مگر مجال ہے کہ اس کے پائے استقلال میں ذرا سی بھی افروزش آئی ہو۔

بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا تھا۔ ضرورت کا اظہار کروں گا تو کفن و فن کے لیے شاید کچھ دے دے۔

نیوی: جب بے چاری پیدا ہوئی تھی۔ اس وقت بھی اس کو کوئی گہوارہ نصیب نہ ہوا۔ آج رخصت ہو رہی ہے تو ثابت نہیں۔۔۔۔۔

ایسے کئی چہرے کے مارکس نے سبے مگر ثابت قدم رہا۔ لندن کے دوران قیام میں کچھ سکون پیدا ہونا شروع ہوا تھا کہ اس کا اکلوتا لڑکا فوت ہو گیا۔ اس کا داغ مفارقت دے جانا قیامت تھا۔ مارکس کو اس سے بہت محبت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لڑکے کی وفات پر پہلی بار اس کو محسوس ہوا کہ صدمہ کیا ہوتا ہے۔ اس حادثے کے بارے میں اس نے اپنے ایک دوست کو خط لکھا اور کہا: ”تبیگو کہتا ہے کہ دنیا میں جو واقعی بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت کی جستجو اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ کوئی ذاتی نقصان یا صدمہ انہیں برداشت نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس قسم کا بڑا آدمی نہیں ہوں لڑکے کی موت نے میری روح اور میرے جسم کو ہلا دیا ہے“ جسم اور روح متزلزل ہونے کے باوجود اس نے اپنی تصنیف کا کام جاری رکھا۔ وہ ایک بہت بڑی حقیقت کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ اس کا دل سیاسی ہنگاموں سے اکتا گیا تھا۔ وہ اپنے اقتصادی نظریات کو کتابی صورت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ یہ کتاب مکمل ہوئی تو مارکس کی مغلسی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ اکیس جنوری سن اٹھارہ سو انسٹھ کو ”اقتصادیات پر تنقید“ کا مسودہ بالکل تیار تھا مگر۔۔۔۔۔

مارکس: امریکہ کے اقتصادی آشوب کا بہت ہی برا اثر پڑا ہے۔ پہلے یہ ٹریڈن

اخبار و مضمون بیت تھا۔ اب کم بخت ایک ہی لیتا ہے۔

بیوی: وہ روپیہ جو امی جان کے انتقال کے بعد میسر آئے تھا ایک برس کے اندر اندر ہی ختم ہو گیا۔

مارکس: بھئی بے شمار قرضے ادا کرنے تھے آدھا تو ان ہی میں اٹھ گیا ہوگا۔ خیر مگر اب سوچنا یہ ہے کہ اس مسودے کا کیا کیا جائے۔

بیوی: کوئی نہ کوئی چھاپ دے گا آپ کیوں اتنی فکر کرتے ہیں؟
مارکس: فکر اس لیے کرتا ہوں کہ مسودہ بھیجنے کے لیے پیسے کہاں ہیں ٹکٹ بغیر بچت دوں

بیوی: (ہنستی ہے) میں ٹکٹوں کا بھول ہی گئی تھی
مارکس: ایک ٹکٹ کہیں سے مل گیا تھا۔ سو انجیلز کو خط لکھا ہے اور اس سے کہا ہے کہ بھائی مسودہ روانہ کرنے کے لیے ٹکٹ چاہئیں کچھ روانہ کر دوتا کہ یہ کام انکا نہ رہے (ہنستا ہے) حد ہو گئی ہے شاید ہی کوئی ایسا معنف ہوگا جس نے دولت پر کتاب لکھی ہو اور وہ خود دولت سے محروم رہا ہو۔۔۔۔۔ اس کتاب کی طباعت کا انتظام ہو جائے تو ارادہ ہے کہ انگریزی ریلوے کمپنی میں ملازم ہو جاؤں۔

بیوی: آپ سے یہ ملازمت نہ ہو سکے گی
مارکس: تو ایک صورت اور ہے وہ یہ کہ اپنے آپ کو دیوالیہ اعلان کر دوں دو لڑکیاں ہیں انہیں تم کسی امیر کے بچوں کو کھلانے کا کام دلو اور ہم تم دونوں کسی ”ورک ہاؤس“ میں چلے جائیں۔

بیوی: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

مارکس: کیا کہہ رہا ہوں ”ورک ہاؤس“ ہم جیسے مادرِ انسانوں ہی کے لیے بنائے گئے ہیں اور مارکس کی لڑکیوں اور ان کے کھانا بیویوں میں کیا فرق ہے جو کئی متمول گھرانوں میں نظر آتی ہے۔

”ورک ہاؤس“ میں جانے اور لڑکیوں کو کھانا بنانے کی نوبت نہ آئی کیوں کہ سن اٹھارہ سو ساٹھ میں اینجلز کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ وصیت کی رو سے وہ اپنے باپ کی فرم کا مالک بن گیا اور اس قابل ہو گیا کہ اپنے دوست مارکس کی زیادہ سے زیادہ مدد دے سکے۔۔۔۔ اس دوران میں مارکس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس نے بھی مارکس کے لیے کچھ چھوڑا۔ غرض یہ کہ غلشی کا دور چھوڑے ہی عرصہ کے لیے ختم ہوا۔ اب فارغ البالی ہوئی تو اس نے 1864ء میں انٹرنیشنل کی بنیاد ڈالی۔ تمام دنیا کے مزدوروں کی تنظیم آسان کام نہ تھا۔ مارکس کو اس سلسلے میں بہت سرزدی کرنی پڑی۔ چونکہ اس کام میں پڑ کر وہ آمدنی کی طرف سے بالکل نافل ہو گیا تھا۔ اس لیے غلشی اور بیماری نے اس کے دروازے پر پھر دستک دی۔

بیوی: مجھے آپ کے دوست اینجلز سے پورا پورا اتفاق ہے ان کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یہ کم بخت کتاب ”سرمایہ“ ہی تمام آفتوں کا موجب ہوئی ہے۔

مارکس: مگر اب تو میں اسے ختم کر چکا ہوں مجھے پوری پوری امید ہے کہ سال کے آخر تک میری مالی حالت بہتر ہو جائے گی میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ مجھے دراصل افسوس اس بات کا ہے کہ میری وجہ سے بے چارہ اینجلز بہت پریشان رہا۔ میری خاطر اسے کاروباری دنیا میں بہت تندی سے کام کرنا پڑا۔ سچ تو یہ ہے نیگم اینجلز آمد نہ کرتا تو یہ کتاب میں کبھی نہ لکھ سکتا۔

بیوی: اب آپ نے پھر ان کو تکلیف دی ہے

مارکس: یقین جانو اگر از حد ضرورت نہ ہوتی تو میں اسے تکلیف نہ دیتا اپنی انگلیاں قلم کر دیتا جنہوں نے اس کو یہ خط لکھا اور امداد چاہی دوسروں کو تکلیف دے کر زندگی کے دن پورے کرتے رہنا واقعی بہت بڑی ذلت ہے لیکن یہ خیال اس ذلت کو دور کر دیتا ہے کہ ایجنڈا اور میں دونوں ایک کام میں برابر کے شریک ہیں۔

بیوی: آپ نے ایک بار کہا تھا کہ مزدور کی سی طرز رہائش اختیار کر لیں گے۔

مارکس: میں نے اس پر بہت غور کیا تم خود اب میری اس رائے سے اتفاق کرو گی، بالکل مزدوروں کی سی طرز رہائش ہمارے موجودہ حالات میں مصلحت کے خلاف ہے۔۔۔۔۔ اگر دو جوان لڑکیوں کی بجائے دو لڑکے ہوتے تو بخدا مجھے ایسی رہائش اختیار کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہوتا۔

بیوی: آپ کی صحت بہت خراب ہو گئی ہے

مارکس: نہیں تو

بیوی: نہیں تو کیا۔۔۔۔۔ کئی بار آپ کہہ چکے ہیں کہ مانگوں میں بہت کمزوری محسوس ہوتی ہے ڈاکٹر بھی آپ سے یہی کہہ چکے ہیں کہ آپ کی صحت بہت گر گئی ہے، اب خدا کے لیے رات کا کام بند کر دیجئے۔

مارکس: رات کا کام بند کروں تو کھاؤں کہاں سے؟

بیوی: یہی تو آفت ہے بغیر کام کئے ایک پیسہ بھی نہیں مل سکتا

مارکس: کتاب چھپ جائے تو میرے دکھ و درد دور ہو جائیں گے۔ اس

صورت میں جب کہ مسودہ گھر میں پڑا ہے میں موت کی خوانش بھی تو نہیں کر سکتا

بیوی: کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہو؟

مارکس: وہ کتاب جس کے لیے میں نے اپنی صحت، اپنی خوشی اور اپنے بیوی بچوں تک کو قربان کر دیا۔ اگر میری موت کے بعد شائع ہو تو کیا مجھے افسوس نہ ہوگا تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو کہ بہت سے آدمی جو اپنے آپ کو مہملی کہتے ہیں میری اس علمی مشغولیت کو بے اثر اور بے کار کہتے رہے ہیں۔ میں ان کی اس بے وقوفی پر ہنستا رہا ہوں۔ یہ میری ہنسی صرف اسی صورت میں کامیاب ہوگی اگر یہ کتاب چھپ گئی۔

بیوی: اصل میں یہی لوگ جو خود کو مہملی آدمی کہتے ہیں بہت بڑے بے عمل ہیں مارکس: اگر میں ”سرمایہ“ کو مرتب کئے بغیر مر جاتا تو اپنے آپ کو انہی بے عمل آدمیوں کے زمرے میں شمار کرتا لیکن مجھ ایسے حساس انسان کے لیے ناممکن تھا کہ انسانیت کی چیخ سنتا اور خاموش رہتا۔ صرف وہی انسان دوسرے انسانوں کے دکھ درد سے بے پرواہ رہ سکتا ہے جس کی کمال موٹی ہو۔

بیاری سے نجات حاصل ہوئی تو 1876ء میں کارل مارکس خود اپنی تصنیف ”سرمایہ“ کا مسودہ لے کر ہمبرگ گیا۔ 12 اگست کو ”سرمایہ“ کی کاپیوں کی تصحیح کا کام ختم ہوا۔ پہلی جلد نکل آئی دوسری اور تیسری جلد میں ترمیم و تنسیخ کا کام ہوتا رہا مگر کارل مارکس کے ہاتھوں سے قدرت کو جو کام کرانا تھا۔ قریب قریب ختم ہو گیا تھا۔ اب اس کی دنیا میں ضرورت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ پہلے اس کی رفیقہ حیات کا 2 دسمبر کو انتقال ہوا اور وہ خود 14 مارچ 1883ء کو بوقت سہ پہر اس جہان سے رخصت ہوا۔ 18 مارچ کو اسے دفن کیا گیا۔ اینجلز نے اس کی قبر پر اقرار کر کے

ہوئے کہا۔

اینجلز: 14 مارچ سہ پہر کو پو نے تین بجے دنیا کا سب سے بڑا دماغ اٹھ گیا۔
اس کی موت سے پرولتاریہ جدوجہد اور تاریخ کے نظریہ واقیعت کو جو صدمہ پہنچا
ہے۔ اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ ڈارون نے اگر قدرت کے ارتقاء کا
قانون دریافت کیا ہے تو مارکس نے سماج کے ارتقاء کا قانون دریافت کیا ہے۔
اس نے موجودہ سرمایہ دارانہ اور بورژوائی سماج کے محرکات بتائے ہیں اس نے
ہمیں سمجھایا ہے کہ انسان کو سیاست، علم، فن اور مذہب کی طرف اپنی توجہ مبذول
کرنے سے پہلے کھانے، پینے، پہننے اور رہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر ملک
کے دستور علوم و فنون اصول و قانون اور ایک حد تک اس کے باشندوں کی شریعت
کے بنیادی اصول اس کے سماج کے اقتصادی حالات میں مضمر ہوتے ہیں اور اگر
کسی ملک کے آئین قوانین اور مذہبی خیالات کی بابت معلوم کرنا ہو کہ وہ کیوں اور
کس طرح پیدا ہوئے تو اس ملک کی اقتصادی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہیے کیوں کہ
زمانے کے اقتصادی حالات ہی ان خیالات کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

جون آف آرک کا مقدمہ

جون آف آرک کے سوانح حیات سے تو قریب قریب آپ سب واقف ہوں گے 1429ء میں فرانس کی حالت بہت بری تھی۔ انگلستان کی فوج فرانسیسی سپاہیوں کو شکست پر شکست دے رہی تھی۔ ہر جگہ انگریزی فوج کا ڈکانچ رہا تھا۔ بنری پنجم کی وفات کے بعد بھی حالات درست نہ ہوئے۔ پیرس انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ چارلس ہفتم تخت سے بد دل ہو گیا تھا۔ اس کے حمایتی جی چھوڑ کر تتر بتر ہو گئے تھے اور لنیز کے شہر کا محاصرہ ہوئے پانچ مہینے ہو چکے تھے۔ قریب تھا کہ یہ انگریزوں کے ہاتھ میں چلا جائے کہ جون آف آرک، دیہات کی ایک سترہ سالہ لڑکی مردانہ وار آگے بڑھی۔ سیدھی چارلس ہفتم شاہ فرانس کے پاس گئی اس سے کہنے لگی کہ مجھے خدا نے تیری مدد کے واسطے بھیجا ہے شروع شروع میں کسی نے اس کا اعتبار نہ کیا مگر کچھ دیر بعد اس نے فرانس کی مردہ فوج میں نئی روح پھونک دی۔ زرہ بکتر پہنے، ہاتھ میں جھنڈا لیے، گھوڑے پر سوار اس نے کئی میدان جیتے اور لنیز کے شہر پر اس انگریزوں کا محاصرہ اٹھ گیا۔ اس کے بعد فتح و نصرت ہر قسم پر فرانسیسی سپاہیوں کے پاؤں چومنے لگی۔ چند مہینوں کی لگاتار کوششوں کے بعد 18 جولائی کو وہ چارلس ہفتم کی رسم تاج پوشی میں شریک تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد جون آف آرک نے واپس دیہات میں چلے جانے کی خواہش ظاہر کی مگر بادشاہ فرانس نے قبول نہ کی اور اصرار کیا کہ وہ اس کے پاس ہی رہے پھر جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے کہ انگریزوں کے قائم مقام ڈیوک آف بیڈفورڈ کی طاقت اور شاہ فرانس

کی سستی اور کم قیمت کی باعث حالات نے پلٹا کھایا۔ پیرس پر انگریزوں نے حملہ کیا جس میں جون آف آرک زخمی ہوئی۔ ایک آدمی بستر روی وندوم نے اسے گرفتار کر لیا۔ انگریز جو اس سے بہت خائف تھے اور پانچ ہزار جوانوں جتنا اہم سمجھتے تھے۔ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ بیڈفورڈ اور بستر روی وندوم کے درمیان سودا شروع ہوا۔ بالآخر جون آف آرک ایک بہت بڑی قیمت پر فروخت ہو کر انگریزوں کے ہاتھ آ گئی۔ روون کے قلعے میں بھاری زنجیریں پہنا کر اسے قید کر دیا گیا۔ تقریباً ایک سال تک اٹھارہ انیس برس کی یہ لڑکی پابہ زنجیر رہی اس کے بعد مذہبی عدالت میں انگریزوں کے ایماء پر اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس کا کوئی وکیل نہیں تھا۔ کھیسائوں کے پادری، لاٹ پادری، بشپ، مفتی، علم دینیات کے بڑے بڑے ماہرین اور قانون دان جن کی تعداد پچانوے تک پہنچتی ہے، اس کے منصف تھے۔

مقدمے کا آغاز

بشپ: جون آف آرک، گاسپل پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ جو سوال تم سے کئے جائیں گے، تم ان کا صحیح جواب دو گی اور سچ بولو گی۔

جون آف کارک: مجھے حکم ہوا کہ میں قسم نہ کھاؤں

بشپ: تمہیں کس نے حکم دیا ہے؟

جون: خدا نے میرے کانوں میں آواز آئی ہے کہ میں قسم نہ کھاؤں اور پھر مجھے

یہ بھی تو معلوم نہیں کہ مجھ سے کیا کیا سوال کئے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ مجھ سے ایسی باتیں پوچھیں جن کا جواب دینا میں مناسب خیال نہ کروں۔

بشپ: تمہیں سچ بولنے کے لیے حلف اٹھانا ہوگا

جون: فرانس میں آ کر میں نے کیا کچھ کیا میرے ماں باپ کون تھے اگر آپ ایسی باتیں پوچھیں تو میں حلف اٹھانے کے لیے تیار ہوں لیکن خدا کی طرف سے مجھے کیا الہامات وصول ہونے اس کے بارے میں آپ کو سچی باتیں بتانے کے لیے میں کبھی حلف نہیں اٹھاؤں گی خواہ میری جان ہی چلی جائے۔

الہامات کے متعلق میں نے صرف اپنے بادشاہ چارلس سے بات چیت کی ہے اور کسی سے نہیں۔

بشپ: تمہاری عمر کیا ہے؟

جون: میرے خیال میں انیس برس کی

بشپ: تم نے دینی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

جون: اپنے ماں باپ سے

بشپ: وہاں سے؟

جون: (ظن کے ساتھ) اس وقت سن لیجئے گا، جب میں اعتراف گناہ کروں

گی

بشپ: اعتراف گناہ کا موقع اب تمہیں نہیں ملے گا اس لیے کہ آئندہ تمہیں گرجا

گھر جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی

جون: کیوں؟

بشپ: اس لیے کہ تم بے دینی اور الحاد کے الزام میں گرفتار ہو
 جون: مجھے یہ پابندی منظور نہیں اور پھر میرے پاؤں میں یہ زنجیریں کیوں
 باندھی جاتی ہیں۔

بشپ: اس لیے کہ تم فرار نہ ہو سکو
 رڈون کے قلعے میں جون آف آرک جس کی عمر انیس برس سے زیادہ نہ تھی،
 قید تھی۔ اس کے پاؤں میں ہر وقت لوہے کی موٹی موٹی زنجیریں رہتی تھیں تاکہ وہ
 بھاگ نہ سکے۔ پہرے پر تین انگریز فوجی افسر متعین تھے۔ مقدمے کی پہلی
 سماعت 22 فروری کو ہوئی تھی، دوسری سماعت دوسرے ہی روز ہوئی۔ ایک بار پھر
 اس سے گوسپل پر دونوں ہاتھ رکھ کر حلف اٹھانے کو کہا گیا تو اس نے انکار کیا مگر بعد
 میں بدرجہ مجبوری اس نے یہ حلف اٹھا لیا سوالات شروع ہوئے۔

جین: بچپن میں تمہارے کیا شغل تھے؟
 جون: سینا پروما اور چہنہ کاننا، زیادہ تر گھر میں رہتی تھی اور باہر کھیتوں میں
 بہت کم جاتی تھی۔

بشپ: سینا پروما تم کیسا جانتی ہو؟
 جون: شہر بھر میں ایسی کوئی عورت نہیں جو سینے پر ونے میں میرا مقابلہ کر سکے۔
 جین: سب سے پہلی الہامی آواز تمہیں کب سنائی دی؟
 جون: جب میں تیرہ برس کی تھی
 جین: یہ آواز کس کی تھی؟

جون: خدا کی۔۔۔۔۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں پاک زندگی بسر

کروں۔۔۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دوپہر کا وقت تھا۔ میں اپنے باپ کے باغ میں کھڑی تھی۔ جب مجھے یہ آواز سنائی دی، میں ڈر گئی۔

دینیات کا ماہر: یہ آواز تمہیں کس طرف سے سنائی دی تھی۔ دائیں طرف سے یا بائیں طرف سے؟

جون: دائیں طرف سے آواز سے پہلے مجھے روشنی دکھائی دی تھی
دینیات کا ماہر: ہوں۔۔۔۔۔ تمہاری نجات کے لیے اس آواز نے تمہیں کیا ہدایات دی تھیں؟

جون: یہ آواز مجھ سے کہتی تھی کہ میں نیک اور پاک زندگی بسر کروں چرچ جایا کروں اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں فرانس جاؤں
جین: شنون کے قلعے میں بادشاہ سے ملاقات کرنے کے لیے بھی اسی آواز نے تمہیں حکم دیا تھا؟

جون: اسی آواز نے چونکہ بشارت ہوئی تھی اس لیے بادشاہ کو میں نے فوراً پہچان لیا

جین: بشارت کے وقت بھی کیا تمہیں روشنی نظر آئی تھی؟
جون: مجھے یاد نہیں

دینیات کا ماہر: بشارت میں جب تم نے اپنے بادشاہ کو دیکھا تو کیا اس کے سر پر کسی فرشتے کا سایہ تھا؟

جون: میں اس کا جواب دینے کے لیے تیار نہیں
جین: یہ الہامی آوازیں کیا تم اکثر سنتی ہو؟

جون: ہر روز سنتی ہوں یہی آوازیں تو میری تسکین کا باعث ہیں

اسی طرح کے سوالات اس پر مقدمے کی تیسری سماعت میں کئے گئے۔ ایک وقت میں کئی آدمی اس پرسوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتے تھے مگر کہتے ہیں کہ وہ مطلق گھبراتی نہیں تھی۔ اس کو جادوگرنی، کافر اور ملحد ثابت کرنے کے لیے یہ عدالت بٹھائی گئی اس لیے ہر منصف کی یہی کوشش تھی کہ جون کے بیانات سے وہ تمام الزام ثابت ہو جائیں جو اس پر لگائے گئے تھے کہ یہ اس نے الہامی آوازوں کا ڈھونگ رچا کر کیسا اور مذہب کی بے حرمتی کی اور ہزار ہا انسانوں کا خون بہایا مقدمے کی تیسری سماعت میں باسٹھ اسیر تھے۔ چوتھی سماعت سے ایک روز پہلے وہ بیمار ہو گئی جس پر شاہ انگلستان کو سخت فکر لاحق ہوئی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جون بیماری سے مر جائے وہ اس کی موت قانون کے ہاتھ سے چاہتا تھا چنانچہ جون کا علاج کیا گیا جب وہ تندرست ہو گئی تو پھر سوالات کا وہی سلسلہ شروع ہوا۔

بشپ: کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتی ہو کہ پریاں بدارواح ہیں؟

جون: مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں

بشپ: تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا سینٹ کیٹیرین اور سینٹ مارگریٹ کو

انگریزوں سے نفرت ہے؟

جون: ان کو صرف انہی چیزوں سے پیار ہے جو ہمارے رسول کو پیاری ہیں

اور وہ ان تمام چیزوں سے نفرت کرتے ہیں جن سے خدا نفرت کرتا ہے

جین: کیا خدا انگریزوں سے نفرت کرتا ہے؟

جون: خدا انگریزوں سے نفرت کرتا ہے یا محبت، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم

نہیں لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ سب انگریز فرانس سے باہر نکال دیئے جائیں گے سوائے ان کے جو یہاں مریں گے اور یہ کہ خدا فرانس کو فتح اور انگریزوں کو شکست دے گا۔

بشپ: کیا خدا اس وقت انگریزوں کے حق میں تھا جب وہ فرانس میں پھل پھول رہے تھے؟

جون: مجھے معلوم نہیں کہ خدا کس کے حق میں تھا لیکن میرا ایمان یہ ہے کہ خدا نے ان کو ان کے گناہوں کی سزا دی۔

دینیات کا ماہر: اگر تم شادی شدہ ہوتیں تو کیا تمہیں الہامی آوازیں سنائی دیتیں؟

جون: میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی

مارڈ بشپ: جون! یہ سب لوگ جو تمہارے سامنے بیٹھے ہیں، صاحبِ علم و فضل ہیں، دینیات کے ماہر ہیں ان سب پر فرض عائد ہے کہ وہ مالِ مہربانی اور شفقت سے کسی انتقامی جذبے کو اپنے دل میں جگہ دینے بغیر تمہیں گمراہی سے بچائیں اور نیکی کا صحیح راستہ بتائیں۔ چونکہ تم ان پڑھ ہو اور دینی علوم سے تمہیں زیادہ واقفیت نہیں ہے اس لیے ہم تمہیں اپنے درمیان میں سے ایک وکیل دینے کے لیے تیار ہیں جس سے تم مشورہ لے سکو گی۔ اگر تم خود ہم میں سے کوئی آدمی اس کام کے لیے منتخب نہ کرو گی تو ہمیں یہ خود یہ انتخاب کرنا پڑے گا۔ بولو اس بارے میں تم کیا چاہتی ہو؟

جون: میں آپ کی اس عنایت کی شکر گزار ہوں آپ کے علاوہ ان سب کی بھی

ممنون و تشکر ہوں جو میرے سامنے بیٹھے ہیں لیکن مجھے کسی وکیل کی ضرورت نہیں اس لیے کہ میں اپنے رسول کے مشوروں سے منہ موڑنا نہیں چاہتی۔ میں اپنی البامی آوازوں کو اس وکیل پر ترجیح دیتی ہوں۔

سارے مقدمے کی تفصیل بیان کرنے کے لیے بہت وقت درکار ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ انصاف کرنے والے جو انصافی کرنے پر تلے ہوئے تھے ایک عرصے تک دیہات کی اس بہادر اور نڈر لڑکی سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔ جب اس کے بیانات ختم ہوئے تو اس کے خلاف بے شمار جرائم کی فہرست تیار کی گئی۔ اس کو دھمکیاں دی گئیں۔ اس سے جھوٹے وعدے بھی کئے گئے کہ اگر وہ اعلانیہ طور پر خود کو نائب ظاہر کرے تو سزا میں رعایت کر دی جائے گی۔ آخر عورت ذات تھی ایک برس کی قید کی تکلیفوں ساٹھ ساٹھ ستر ستر آدمیوں کی جرح نے اور پاؤں کی زنجیروں نے اس بے چاری کو سخت پریشان کر دیا تھا۔ موت سے کون خوف نہیں کھاتا اور پھر وہ موت جو آگ میں جل کر نصیب ہو، کتنی ہولناک ہے جو نے ڈر کے مارے منصوفوں کے کہنے پر اپنے نائب ہونے کا اعلان کر دیا۔ سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی گئی اور اس سے وعدہ کیا گیا کہ اس کو باقاعدہ نماز پڑھنے کی اجازت مل جائے گی مگر شاہ انگلستان اس فیصلے سے کیسے مطمئن ہو سکتا تھا چنانچہ ایک چال چلی گئی۔ قید خانے سے عورتوں کا لباس ہٹایا گیا۔

بشپ: تم نے پھر مردوں کا لباس پہن لیا ہے؟

جون: میں نے اپنی مرضی سے پہنا ہے اس لیے کہ میرے خیال کے مطابق

اس وقت یہی لباس بہتر ہے۔

بشپ: تم نے اتنے آدمیوں کے سامنے قسم کھانی تھی کہ تم پھر کبھی یہ لباس نہ پہنو گی؟

جون: میرا ہرگز یہ منشاء نہیں تھا کہ یہ لباس ترک کرنے کی قسم کھاؤں

بشپ: سوال یہ ہے کہ تم نے مردوں کا لباس کیوں پہنا؟

جون: اس لیے پہنا ہے کہ اس وقت یہی موزوں و مناسب ہے اس لیے کہ میں مردوں کے درمیان رہتی ہوں میں نے یہ لباس اس لیے پھر اختیار کیا ہے کہ مجھ سے جو وعدے کیے گئے تھے۔ پورے نہیں ہوئے مجھ سے کہا گیا تھا کہ مجھے گرے میں جانے کی اجازت دی جائے گی اور میرے پاؤں کی زنجیریں ہٹالی جائیں گی مگر کچھ بھی تو نہیں ہوا۔

بشپ: تائب ہوتے وقت کیا تم نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ یہ لباس ترک کر دو گی؟
جون: اگر آپ میری زنجیریں جدا کر دیں مجھے کسی اچھے قید خانے میں رکھیں اور میرے ساتھ کسی عورت کے رہنے کا انتظام کریں تو میں یہ لباس اتار دوں گی۔

بشپ: کیا تم نے تائب ہونے کے بعد بھی الہامی آوازیں سنی ہیں؟

جون: سنی ہیں

بشپ: کیا کہا گیا ہے تم سے؟

جون: مجھ سے خدا نے سینٹ کیتھرائن کے ذریعے سے یہ کہلوایا ہے کہ میں نے تائب ہونے میں سخت غلطی کی ہے۔ جان بچانے کے لیے میں نے اپنی روح کو پستیوں میں گرا دیا ہے۔۔۔ لیکن میں کیا کرتی۔ میں اس وقت ڈر گئی تھی

اگر میں کہتی کہ مجھے خدا نے بھیجا ہے تو مجھے آگ میں جھونک دیا جاتا۔۔۔۔۔ لیکن سچی بات یہی ہے کہ مجھے خدا نے بھیجا ہے۔۔۔۔۔ اور خدا نے مجھ سے کہا ہے کہ اس کا مکلم کھلا اعلان کرنے سے خائف ہو کر میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔

بشپ: کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ آواز سینٹ کی تھیں؟
جون: مجھے اس کا یقین ہے اور میں اس پر بھی ایمان رکھتی ہوں کہ یہ آوازیں خدا کی طرف سے آتی ہیں۔

بشپ: تائب ہوتے وقت تم نے ہزار ہا آدمیوں کے سامنے مانا تھا کہ ان آوازوں کے متعلق تم نے جھوٹ بولا تھا؟

جون: میں نے اس وقت جو کچھ کہا آگ سے ڈر کر کہا لیکن میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی جو خدا اور مذہب کے خلاف ہو۔۔۔۔۔ اگر آپ لوگوں کی اسی میں خوشی ہے کہ میں زمانہ لباس پہنا کروں تو میں یہی لباس پہن لیا کروں گی لیکن اس کے سوا میں اور کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں۔

بشپ: تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ آوازیں جو تمہیں سنائی دیتی ہیں نیک ارواح کی ہیں یا بد ارواح کی؟

جون: مجھے معلوم نہیں خدا بہتر جانتا ہے
دوسرا پادری: کیا آوازیں سچ مچ حقیقی ہوتی ہیں؟
جون: حقیقی ہوں یا مصنوعی، مجھے سنائی دیتی ہیں نیک ارواح کی ہوتی ہیں یا بد ارواح کی؟ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

بشپ: ہمارا خیال ہے کہ دراصل ان کی کوئی حقیقت نہیں
 دوسرا پادری: تم غور کرو کہ یہ آوازیں تم سے کئی بار کہہ چکی ہیں کہ اس مقدمے
 سے تم بری ہو جاؤ گی مگر تم بری نہیں ہوئیں۔

بشپ: ان آوازوں نے اس دوران میں تم سے کئی وعدے کئے ہیں سچ سچ کہو
 ان میں سے کوئی وعدہ پورا ہوا ہے؟

دوسرا پادری: یہ تمہارا وہم تھا۔
 بشپ: ممکن ہے بد ارواح نے تمہیں گمراہ کیا ہو۔
 دوسرا پادری: تمہیں غور کرنا چاہیے سوچنا چاہیے

جون: (گھبرا کر) مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری موت کے باعث آپ ہی
 ہوں گے۔

بشپ: جون! انجام جو کچھ بھی ہوگا تمہیں مبر کے ساتھ برداشت کرنا پڑے گا۔
 مزائے موت تمہیں صرف اس لیے ملے گی کہ تم اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکی
 ہو۔

دوسرا پادری: جو کہ سب سے بڑا جرم ہے خدا اور کھلیسا کا
 بشپ: جون! اب سوچو کہ تمہاری آوازیں کدھر گئیں۔ ان سے تمہیں کیا فائدہ
 پہنچا ہے یہ تمہیں موت کے منہ سے بچا سکتی ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کبھی نہیں کیا ان
 آوازوں نے تمہیں صریحاً دھوکہ نہیں دیا؟

جون: ابظاہر یہی معلوم ہوتا ہے
 بشپ: ابظاہر نہیں، حقیقت میں ان آوازوں نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔ کیا اب

بھی تمہیں ان کی صحت پر یقین ہے؟

جون: مجھے اب سوائے خدا کے اور کسی پر یقین نہیں

بشپ: شاباش

دوسرا پادری: کیا ان آوازوں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا؟

جون: دیا ہے

دوسرا پادری: شاباش

انیس برس کی مائو اس لڑکی پر بالآخر اس کے منصوبوں نے فتح پائی۔ چنانچہ جون دوسرے روز صبح نو بجے اس قید خانے سے نکالی گئی جہاں اس نے ایک سو اٹھتر دن جسمانی اور روحانی اذیتوں میں گزارے تھے۔ اس کو ایک چمکڑے میں بٹھایا گیا اور اسی ہتھیار بند فوجیوں کے پیہرے میں وہ پرانی منڈی کے چوک میں لائی گئی جہاں تین بڑے بڑے مچان تیار کئے گئے تھے۔ ایک چبوتری پر پادری وغیرہ بیٹھے تھے جنہیں فیصلہ سناتا تھا۔ دوسرے چبوترے پر جون کو کھڑا کر دیا گیا۔ تیسرے چبوترے پر جو چونے اور کچے کا بنا ہوا تھا۔ چوک کے عین درمیان تھا۔ اس پر ایندھن کا ایک انبار لگا تھا۔ چوک میں اتنے تماشاخی جمع تھے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ کھوے سے کھوے چمکاتا تھا۔ بہت بڑے میلے کا ماں تھا۔ چھتوں پر کھڑکیوں میں برجگہ تماشاخیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ فیصلہ سنایا گیا۔

بشپ: ہم فتویٰ دیتے ہیں کہ تم ایک گمراہ اور ملحد عورت ہو۔ اس خیال سے کہ تم دوسرے عیسائیوں کو گمراہی اور الحاد کا راستہ نہ دکھاؤ۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں چرچ کے رشتے سے منقطع کر دیا جائے اور تمہیں عام انسانی عدالت کے حوالے کر

ہو۔۔۔۔۔ میرا خیال تھا کہ مجھے بھی فرانس سے محبت ہے۔۔۔۔۔ تم کہتو میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ مجھے فرانس سے محبت نہیں تھی، میں نے اس سے غداری کی۔۔۔۔۔ میں یہ سب کچھ ماننے کے لیے تیار ہوں۔۔۔۔۔ لیکن مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔ میں سب سے معافی مانگی ہوں، انگریزوں سے جنہیں میں اپنے وطن کا دشمن سمجھتی رہی ہوں۔۔۔۔۔ ان سپاہیوں سے جو میرے جھنڈے تلے ان انگریزوں سے لڑتے رہے ہیں۔ میں سب سے گڑگڑا کر معافی مانگتی ہوں۔۔۔۔۔ پادریوں، مفتیوں اور دینیات کے ماہروں سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ میری نجات کے لیے دعا مانگیں۔

آمریبا آدھے گھنٹے تک جون آنکھوں میں آنسو لے اس طرح گڑا گڑا کر
تماشا نیوں سے معافی مانگی رہی لیکن اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اس دوسرے چبوترے پر
کھڑا کر کے ارد گرد ایندھن کی لکڑیاں چن دی گئیں۔ کہتے ہیں کہ اس نے انگریز
سے جو اس کے پاس ہی چبوترے پر کھڑا تھا صلیب مانگی اس انگریز نے دو تھکے
جوڑ کر صلیب بنائی اور جون کو دے دی۔ جون نے یہ صلیب اپنے سینے کے ساتھ لگا
لی۔ ایندھن کو آگ دکھائی گئی۔ خشک لکڑیاں چیخ چیخ کر اس ظلم کی فریاد کرنے لگیں۔
گاڑھے دھوئیں نے کنواری جون کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ چھ مرتبہ اس نے ”
یسوع مسیح“ کہا۔۔۔۔۔ اس کے بعد کوئی آواز اس کی چتا سے نہ
آئی۔۔۔۔۔!



انصاف

دروازہ کھلتا ہے۔ چوہدار تین مرتبہ فرش پر اپنی انٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوہدار: بابا اوب، باملاحظہ، ہوشیار، نظریں رو برو، شہنشاہ عالم لٹچ کے لیے تشریف لارہے ہیں۔

شہنشاہ عالم کے قدموں کی بھاری چاپ سنانی دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ تشریف لاتے ہیں۔ شہنشاہ: ہیڈ بلکر کہاں ہے؟

چوہدار ایک بہت بڑی ڈش سے سرپوش اٹھاتا ہے۔ ہیڈ بلکر پھدک کر باہر نکلتا ہے اور عرشی سام کرتا ہے۔

ہیڈ بلکر: غلام سیلوٹ بجالاتا ہے جہاں پناہ

شہنشاہ: دسترخوان پر آج مابدولت کے لیے کیا کیا چیز حاضر ہے؟

ہیڈ بلکر: گوشت پلاؤ، مادی پلاؤ، مٹر پلاؤ، مارنگی پلاؤ، تنجن، بریانی، زردہ، روغن جوش، قورمہ، ٹماٹر گوشت، بھنڈی گوشت، مٹر گوشت، پائے کا شوربہ، قیمہ بھیجا، چکن کٹالس، چکن چاپس، مٹن چاپس، پوٹو چانس اور خدا جہاں پناہ کا بھلا کرے ارہر کی دال

شہنشاہ: (غصے میں) ارہر کی دال، مابدولت کو بالکل پسند نہیں

ہیڈ بلکر: یور میجسٹی، آج لٹچ پر تین اشتراکی والایتیوں کے وزیر اعظم مدعو ہیں اس

لیے۔۔۔۔

شہنشاہ: (خوش ہو کر) مابدولت تمہاری فراست کی داد دیتے ہیں اور خوش ہو کر تمہارا منہ موتیوں سے بھر دینے کا حکم جاری کرتے ہیں۔

ہیڈ بلر: میری سانس رک جائے گی عالم پناہ
شہنشاہ: (مسکرا کر) تم بہت ذہین ہو اچھا مابدولت تمہیں سر کا خطاب عنایت کرتے ہیں۔

ہیڈ بلر: جہاں پناہ کی اس قدر افزائی نے ذرے کو آفتاب بنا دیا۔
شہنشاہ: اور کس صفائی سے بینک لگی نہ بھٹکوی
ہیڈ بلر: غلام سیلوٹ بجالاتا ہے، یور میجسٹی
دروازہ کھلتا ہے چوہدرتین مرتبہ فرش پر اپنی لائٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوہدرار: با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار، نظریں رو برو، با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار،
نظریں رو برو ملکہ عالیہ کی سواری آتی ہے۔
چھوٹے چھوٹے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے ملکہ عالیہ کی سواری آتی ہے۔

ملکہ: جہاں پناہ کو زیادہ دیر تو میرا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میں اپنی خادماؤں کے سر میں جوئیں ڈلواری تھی۔

شہنشاہ: کیوں؟

ملکہ: رعایا کے لیے میں ایک بلڈ بینک کھولنے کا ارادہ رکھتی ہوں
شہنشاہ: امور سلطنت سے تمہاری یہ دلچسپی مابدولت کے لیے باعث مسرت

ہوتی۔۔۔۔۔!

ہیڈ بلٹر: رعایا کتنی خوش نصیب ہے کہ آپ ایسا مخلص بادشاہ اور آپ ایسی مخلص ملکہ اس پر حکمران ہیں۔

شہنشاہ: پہلے یونہی مشہور تھا کہ فلاں بادشاہ کے راج میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے لیکن ہمارے راج میں ایسے کئی گھاٹ موجود ہیں جہاں شیر اور بکری اکٹھے پانی پیتے ہیں اور اس کو حادثہ امکان میں لانے کے لیے مابدولت کو تمام شیروں کے دانت نکلوانے اور تمام بکریوں کے سینگ کٹوانے پڑے۔

ہیڈ بلٹر: اس میں کیا شک ہے

گھٹی کی آواز بلند ہوتی ہے

شہنشاہ: (چونک کر) یہ کس نے ہمیں بلایا یہ کون فریادی ہے جس نے عدل و انصاف کی مہنی زنجیر کو جھنش دی؟

ملکہ: جہاں پناہ! کیا اسی وقت تشریف لے جائیں گے؟

شہنشاہ: اسی وقت، اسی گھڑی، جب تک ہم اس فریادی کی فریاد نہیں سن لیں گے اور ہر کی دال ہم پر حرام ہے۔ ہم ابھی جھرو کے میں جا کر فریادی سے ملاقات کریں گے، ضرور کسی انسان پر ظلم ہوا ہے۔

چو بد ارتین مرتبہ فرش پر اپنی لائٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چو بد ارت: با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار، نظریں رو برو، با ادب، با ملاحظہ ہوشیار،

نظریں رو برو، شہنشاہ عالم فریادی کی فریاد سننے کے لیے تشریف لارہے ہیں۔

شہنشاہ، ملکہ اور ہیڈ بلٹر تینوں باہر جھرو کے میں تشریف لے جاتے ہیں۔

شہنشاہ: یہ کون تھا جو نے ہمارے عدل و انصاف کی مہنی زنجیر ہلائی اور ہمارا انصاف چاہا۔

فریادی: یہ غلام انصاف کا طالب ہے جہاں پناہ
شہنشاہ: تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف ہو گا فریادی دودھ کا دودھ اور پانی کا
پانی الگ کرنا ہمارا کام ہے۔

فریادی: عالم پناہ آج کل کے ایک سیر دودھ میں صرف دو قطرے دودھ کے
ہوتے ہیں باقی سب پانی ہوتا ہے۔

شہنشاہ: مسمن رہو فریادی دودھ کے یہ دو قطرے ہی علیحدہ کر کے دکھا دینے
جائیں گے۔ بولو، بے خوف و خطر ہو کر بولو کہ تمہیں کس نے دکھ پہنچایا ہے کیا ملکہ
عالم کے پستول سے تمہاری بیوی۔۔۔۔۔؟

فریادی: نہیں عالی جاہ! ملکہ عالم کے پستول سے میری بیوی ہلاک نہیں ہوئی۔
شہنشاہ: تاریخ نے خود کو نہیں دہرایا۔ یہ بھی ایک بہت بڑی بات ہے بولو، تم
کام کیا کرتے ہو؟

فریادی: عالم پناہ کے سائے تلے اس غلام نے ایک بہت بڑی انڈری کھول
رکھی ہے۔

شہنشاہ: کپڑے گھاٹ پر تم خود دھو تے ہو؟

فریادی: نہیں عالم پناہ! یہ ذلیل کام میں نے دوسروں کے سپرد کر رکھا ہے۔

شہنشاہ: ایسا ہی ہونا چاہیے اب بتاؤ تمہیں کیا دکھ پہنچا ہے؟

فریادی: جہاں پناہ! مجھے بہت بڑا دکھ پہنچا ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں جو

میں بیان کر سکوں۔

شہنشاہ: (جموڑی دیر غور و فکر کرنے کے بعد) فریادی! تم کوئی فکر نہ کرو۔ ہم الفاظ کا بندوبست کئے دیتے ہیں ہیڈ بلئر؟

ہیڈ بلئر: غلام حاضر ہے جہاں پناہ

شہنشاہ: جموڑا اسی عرصہ ہوا ہم نے سر کے خطاب سے تمہیں سرفراز کیا تھا
ہیڈ بلئر: غلام اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کر چکا ہے۔

شہنشاہ: اب خود کو اس قدر افزائی کا حق دار ثابت کرو۔ ہم تمہیں وزیر الفاظ کا رتبہ بخشتے ہیں تاکہ تم اس فریادی کی فریاد کو مناسب و موزوں الفاظ میں ترتیب دے کر ہماری خدمت میں پیش کرو۔

ہیڈ بلئر: غلام اس فرض سے سبکدوش ہونے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔
شہنشاہ: تم مسمن ہو فریادی؟

فریادی: میں بالکل مسمن ہوں غلام پناہ

شہنشاہ: وزیر الفاظ جاؤ، فریادی کی فریاد ایک رپورٹ کی صورت میں پیش کرو۔

ہیڈ بلئر: کام کی اہمیت کے پیش نظر غلام ایک ماہ کی مہلت کے لیے درخواست کرتا ہے

شہنشاہ: مابدولت دو ماہ کی مہلت عطا کرتے ہیں

ہیڈ بلئر: شکریہ!

فریادی: شکریہ!

فریادی: یہ نسخہ سینہ بہ سینہ چلا آ رہا ہے عالم پناہ

شہنشاہ: خوب!

ہیڈ بلر: ڈرائی کلیننگ کے کام میں بھی فریادی پٹرول استعمال نہیں کرتا۔

فریادی: غلام، پٹرول کا سارا کوٹہ بلیک مارکیٹ میں بیچ دیتا ہے۔

شہنشاہ: بہت خوب!

ہیڈ بلر: فریادی کی لائڈری میں ساڑھے سات سو دھوبی کام کرتے ہیں۔ ان

کو سینہ بہ سینہ چلنے والے اصولوں کے پیش نظر وہی تنخواہ ملتی ہے جو مغلیہ بادشاہوں

کے عہد میں دھوبیوں کو ملا کرتی تھی۔ فریادی نے چار مہینے ہوئے محسوس کیا کہ اس

کے یہ تنخواہ پانے والے ملازم اس کا صابن کھا رہے ہیں۔

شہنشاہ: فریادی نے یہ کیسے محسوس کیا؟

فریادی: ان کا رنگ دن بدن اجلا ہو رہا تھا جہاں پناہ

شہنشاہ: درست

ہیڈ بلر: انہوں نے صابن کھانے ہی پر اکتفا نہ کی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس غریب کا

پٹرول بھی پینا شروع کر دیا۔

فریادی: عالم پناہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ان کی دھواں دھار آتھریوں نے غمازی کی

شہنشاہ: درست

ہیڈ بلر: اپنے تنخواہ پانے والے ملازمین کی اس بلا خوری اور بانوشتی سے تنگ آ

کر فریادی نے ایک روز کپڑے سکھانے کے لیے ان کو اس میدان کی طرف روانہ

کر دیا جہاں شہزادیاں چاند ماری سیکھتی ہیں۔

شہنشاہ: (فکر مند ہو کر) والا شان شہزادیوں نے بے گناہوں کو ہلاک کر دیا؟
 ہیڈ بلر: ایسا ہی ہوا جہاں پناہ۔۔۔ شہزادیوں کو یہ غلط فہمی رہی کہ وہ ساڑھے سو
 دھوبی جنگلی انسانوں کی وہ کھیپ ہے جو والا شان شہزادیوں کا نشانہ درست کرنے
 کے لیے عالم پناہ کے احکام کے مطابق ہر نئے فراہم کی جاتی ہے۔
 شہنشاہ: دھوبیوں اور جنگلی انسانوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔
 ہیڈ بلر: عالم پناہ کا ارشاد بالکل صحیح ہے ساڑھے سات سو دھوبیوں کے لواحقین
 چنانچہ فریادی کو ان کی ہلاکت کا ذمہ دار گردانتے ہیں۔

فریادی: فریادی کا قصور صرف اتنا ہے جہاں پناہ کہ اس نے تگ آ کر ان کو
 اس میدان کی طرف روانہ کر دیا جہاں والا شان شہزادیاں نشانہ درست
 کریں۔۔۔ لیکن افسوس ناک ہلاکت کے بعد جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ غیر
 ارادی طور پر اس غلام نے جہاں پناہ کو انصاف کرنے کا ایک بہت ہی اچھا موقع
 بہم پہنچا دیا ہے۔

شہنشاہ: غور کرنے کے بعد مابعد دولت بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں تاریخ میں اس
 سے پہلے جہانگیر کو ایسے موقع سے دو چار ہونا پڑا تھا لیکن ہم عہد جدید کے شہنشاہ
 ہیں۔۔۔۔۔ جہانگیری عدل فی زمانہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا خون کا بدلہ صرف
 خون ہے۔

ہیڈ بلر: کیا والا شان شہزادیاں خاکم بدہن۔۔۔

شہنشاہ: وزیر الفاظ! تمہیں اپنا فرض ادا کرنے دو

چوہدرتین مرتبہ فرش پر اپنی لائٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے

چو بدار: با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار، نظریں رو برو، با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار،
نظریں رو برو۔۔۔۔۔ ملکہ عالیہ کی سواری آتی ہے۔

ملکہ عالیہ کی سواری بال کھولے ہوئے آتی ہے۔

ملکہ: جہاں پناہ! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟

شہنشاہ: خون کا بدلہ خون ہماری مملکت کے ہر در دیوار سے یہی صدا آرہی ہے
خون کا بدلہ خون۔۔۔۔۔ کوئی خون بہانہ ہوگا۔۔۔۔۔!

ملکہ: جہاں پناہ

ہیڈ بلر: عالم پناہ!!

فریادی: ساڑھے سات سو دھویوں کے لواحقین گیتی پناہ، خون کا بدلہ خون نہیں
چاہتے۔۔۔۔۔ فی دھوبی پانچ سو روپے کافی ہیں۔

شہنشاہ: نہیں، مابدولت اپنے دامن عدل پر جہانگیر کی طرح کوئی دھبہ نہیں
لگنے دیں گے۔۔۔۔۔ خون کا بدلہ خون ہے خون بہا نہیں خون کا بدلہ صرف خون
ہے۔۔۔۔۔ وزیر الفاظ! والا شان شہزادیوں کی تعداد کیا ہے؟

ہیڈ بلر: پچھلے برس کے اعداد و شمار کے مطابق والا قدر شہزادیوں کی تعداد ایک
سو بیس تک پہنچی تھی جہاں پناہ

ملکہ: ان میں میری کوئی دختر شامل نہیں لیکن میں جہاں پناہ سے پھر بھی
درخواست کرتی ہوں کہ۔۔۔۔۔

شہنشاہ: ہمیں اپنے فرض سے سبکدوش ہونے دو ملکہ۔۔۔۔۔ خون کا بدلہ
خون ہے

فریادی: جہاں پناہ! ان ساڑھے سات سو دہائیوں میں خون کا صرف ایک قطرہ تھا

شہنشاہ: تمہیں کیسے معلوم ہے؟

فریادی: سارا خون نچوڑ کر میں نے صرف ایک قطرہ باقی چھوڑ دیا تھا کہ ان میں زندگی کی رقم باقی رہے۔

شہنشاہ: مابدولت کی نگاہ عدل میں خون کے ایک قطرے اور خون کے ایک سمندر میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے پیشتر کہ رجعت پسند قوتیں ہمیں گمراہ کرنے پائیں مملکت کے طول و عرض میں ریڈیو اور اخباروں کے ذریعے سے اعلان کر دیا جائے کہ ہم انڈری والے کیس کا فیصلہ کرنے میں اپنی مثالی غیر جانب داری سے کام لینے کا تہیہ کر چکے ہیں۔۔۔۔۔ خون کا بدلہ خون ہے۔۔۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ والا شان شہزادیوں کی رگوں میں ہمارا نیلا خون دوڑ رہا ہے لیکن اسے دھوبیوں کے سرخ خون کا بدلہ دینا ہوگا۔۔۔۔۔ ہر چہارا کناف اعلان کر دیا جائے کہ مابدولت نے اس سنگین مقدمے کا فیصلہ مرتب کرنے کے لیے ایک کمیشن بٹھا دیا ہے۔

ہیڈ ہٹار: کمیشن؟

ملکہ: کمیشن؟؟؟

فرمادی: کمیشن؟؟؟

شہنشاہ: ہاں کمیشن یہ کمیشن ملک کے دو سب سے بڑے دہویوں، دو سب سے بڑے ڈرائی کمیزوں اور چھ سب سے بڑے خطاب یافتہ سرکاری منصفیوں پر

غالب اور سرکاری ملازمت

حکیم محمود خان مرحوم کے دیوانِ خاناے کے متصل یہ جو مسجد کے عتب میں ایک مکان ہے مرزا غالب کا ہے۔ اسی کی نسبت آپ نے ایک دفعہ کہا تھا۔

مسجد کی زیر سایہ ایک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ نامسایہ خدا ہے

[illegible]

(مرزا صاحب سے کانڈ لیتے ہوئے)

منشی شونرا سن : تو کیا چ مجھ یہ غزل آپ کی نہیں؟

غالب: (بھنا کر) بھائی حاشا! تم حاشا اگر یہ غزل میری ہو۔ اسی اور لینے کے دینے پڑے ہیں۔ لا حول والا اس غریب کو میں کچھ کیوں کہوں لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت اس سے آگے ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا قبلہ آپ نے کیا خوب کیا ہے۔

اس اس جفا پہ بتوں سے وفا کی

میرے شیر شہاباں رحمت خدا کی

میں نے اس سے کہا اگر یہ میرا مطاع ہو تو مجھ پر اعنت بات یہ ہے کہ ایک شخص

میرمانی اسد ہو گزرے میں اور یہ غزل انہی کے شاندار کلام کا نمونہ ہے۔

منشی شوزائن تم طرز تحریر پر بھی غور نہیں کرتے
منشی شوزائن: (کاغذ تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے) مجھے افسوس
ہے (مرزا غالب کا نوکر کا داخل ہوتا ہے)
کلو: حضور منشی غلام رسول صاحب آئے ہیں
غالب: تشریف لائیں
(کلو کمرے سے باہر جاتا ہے اور منشی غلام رسول داخل ہوتے ہیں)
غلام رسول: بتلیم بجالاتا ہوں مرزا صاحب
غالب: بتلیم، کہئے کیوں کر آتا ہوا منشی صاحب
غلام رسول: مسٹر نائن صاحب سیکرٹری بیمار نے آپ کی خدمت میں سلام
عرض کیا ہے ان کا خیال ہے کہ جناب کو کالج میں فارسی کا استاد مقرر کریں
منشی شوزائن: مبارک ہو مرزا صاحب
غالب: ابھی پوری بات تو سن لو۔۔۔۔۔ ہاں تو اور کیا منشی صاحب؟
غلام رسول: انہوں نے کل دس بجے آپ کو بلایا ہے
غالب: بہتر، میری طرف سے بہت بہت سلام عرض کیجئے گا اور کہئے گا کہ
زہے نصیب آپ نے مجھے منتخب فرمایا ہے۔۔۔۔۔ میرا شکریہ قبول ہو۔
غلام رسول: تو میں سیکرٹری صاحب بیمار کی کوٹھی کے باغ میں حاضر
رہوں گا اور جو نبی آپ تشریف لائے گا فوراً آپ کی تشریف آوری کی خبر کر دوں
گا۔

غالب: آپ کی فواش ہے، میں وقت پر حاضر ہو جاؤں گا

غلام رسول: اچھا تو میں اجازت چاہتا ہوں

(منشی غلام رسول کمرے سے باہر چلے جاتے ہیں)

منشی شوزائن: (مسکراتے ہوئے) اب تو اجازت ہے مبارک باد دینے کی
نالب: (مسکرا کر اٹھتے ہوئے) نہیں سب سے پہلے مجھے اپنی بیگم کی مبارک

باد لینے دو۔

مرزا غالب زمان خانے میں خوش خوش داخل ہوتے ہیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ
امراؤ بیگم بیٹھی وضو کر رہی ہیں انہیں دیکھتے ہی انہوں نے منہ سجایا اور کہنا شروع
کیا۔

امراؤ بیگم: آج دو روز سے کہہ رہی ہوں کہ ایک وقت میرے پاس بیٹھ کر
ٹھنڈے دل سے میری چند باتیں سن لیجئے پر آپ کو فرصت کہاں

نالب: (پاس ہی چوکی پر بیٹھ کر) بیگم صاحبہ! مجھے معلوم ہے کہ آپ مہین مہین
چٹکیاں لے کر نصیحتیں یا شخصیتیں کیجئے گا۔ خیر فرمائیے۔

امراؤ بیگم: (چڑ کر) دیکھئے پھر آپ نے طعن طرہ کی باتیں شروع کر دیں۔

نالب: (زیر لب مسکراتے ہوئے) اچھا جو آپ کہنا چاہتی ہیں کہنے

امراؤ بیگم: میں کہتی ہوں کہ کب تک گھر کا اساسہ بیچ کر گزراں ہوگی۔ کس
طرح یہ بیل منڈھے چڑھے گی۔ قرض کس صورت سے ادا ہوگا۔ اے قرض جائے
جہنم میں روزمرہ کے مصارف کس طرح پورے ہوں گے اب تو لتے بدن پر
جھولنے کا زمانہ آ گیا ہے۔

نالب: (پراسرار طریقے پر مسکراتے ہوئے) آپ گھبراہٹ مت خدانے سن

لی ہے (چو کی پر سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہیں)

امراؤ نیگم: کیا سن لی ہے خدا نے؟

نالب: (فاتحانہ انداز میں) آپ کے وظیفوں کی برکت سے مسٹر ناسن بہادر نے مجھے بلایا ہے کالج میں فارسی زبان کا استاد مقرر کرنا چاہا ہے اور یقینی طور پر میری ہی اک ایسی ذات ہے جو اس عہدے کے لائق ہے۔

امراؤ نیگم: اپنے منہ میاں مٹھو

نالب: جی سن تو لیجئے کم سے کم سے کچھ نہیں تو سو ڈیڑھ سو روپیہ ماہو اتو میرا مقرر ہو ہی جائے گا لئے اب خوش ہونیں

امراؤ نیگم: (اونا لے کر اٹھتے ہوئے) ہو گئی

نالب: تو ذرا ہنس لیجئے

امراؤ نیگم: چو چلے نہ بگھاریئے

نالب: (خوش طبعی سے) نہیں میری جان کی قسم ہنسوتا کہ ذرا مجھے تمہاری طرف سے اطمینان ہو۔

امراؤ نیگم: (کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہے)

نالب: (اطمینان کے ساتھ) خدا میری نیگم کو ہنستا ہی رکھے، بھیجی امراؤ نیگم تم نالب کی روح ورواں ہو۔

امراؤ نیگم: اب اپنی شاعری رتبے دیجئے اور صاحب سکتر بہادر کے ہاں جانے کی تیاری کیجئے۔

دوسرے روز صبح کو مرزا نالب مسٹر ناسن سے ملاقات کرنے کے لیے تیار

ہونے لگے۔

نائب: (منظرب حالت میں) کیوں میاں مداری یہ کلو دارونڈ کہاں گئے؟
مداری: جی ابھی تو یہیں تھے حضور شاید معظم علی عطر فروش کی دکان پر بیٹھے ہوں گے

نائب: ذرا بلانا مجھے سکتر بہادر کے ہاں جانا ہے مرے درباری کپڑے نکال دیں۔

مداری: (قدموں کی چاپ سن کر) لیجئے کلو دارونڈ آ گئے۔
(کلو داخل ہوتا ہے)

کلو: آپ نے مجھے یا فرمایا

نائب: بھئی کلو تم کہاں دن بھر نائب رہتے ہو؟

کلو: کیا حکم ہے سرکار؟

نائب: ذرا میرے درباری کپڑے نکالو، مجھے آج دس بجے سیکرٹری صاحب بہادر کے ہاں جانا ہے۔

کلو: (جا کر پلٹتے ہوئے) کیوں سرکار وہ شمالی چوند اور دستار ضرور نکالی جائے گی جوڑا کون سا نکالا جائے گا؟

نائب: وہ نمائندے کی جامدانی کا انگر کھایا وہ ریشمی دھاری اور قلم کار اور جوتا ہی سلیم شاہی جو آج آٹھ روز ہوئے میں نے خریدا ہے۔۔۔ ہاں ادراک شمالی رومال بھی نکال لینا۔

درباری کپڑے پہن کر مرزا نائب تیار ہوئے اور ہوادار میں سیکرٹری صاحب

بہادر کی کوٹھی پر پہنچے۔ منشی غلام رسول پائیں باغ میں پونے دس بجے سے ان کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ جونہی کباروں نے ہوا دار کندھوں سے اتارا، منشی غلام رسول مسٹر نامسن بہادر کو خبر دینے کے لیے کوٹھی کے اندر داخل ہوئے۔

غلام رسول: سرکار مرزا غالب سلام عرض کرتے ہیں اور فرماتے ہیں حسب الحکم میں حاضر ہوں۔

نامسن: (گھڑی دیکھتے ہوئے) بہت پابندی وقت سے تشریف لائے اچھا سلام دو اور کہو تشریف لائیں۔

منشی غلام رسول: باہر آئے غالب چہل قدمی کر رہے تھے۔

غلام رسول: حضور تشریف لے چلے صاحب بہادر یا فرماتے ہیں

غالب: (حیرت سے) کیا کہا؟

غلام رسول: آپ کو بلایا ہے حضور

غالب: بلایا ہے؟ دستور کے موافق صاحب سکتر بہادر مجھ ماجیز کو لینے آئیں تو

میں چلا چلوں گا۔

غلام رسول: بہتر میں جا کر عرض کرتا ہوں

منشی غلام رسول: ایک بار پھر اندر آ گئے اور مسٹر نامسن سے کہا

غلام رسول: حضور وہ فرماتے ہیں کہ حسب دستور میرے لینے کو آئیں تو میں

چلوں

نامسن: (مسکرا کر) بڑے بگڑے دل و دماغ دار معلوم ہوتے ہیں چلو میں خود

ان سے بات کرتا ہوں۔

مسٹر نامسن کوٹھی سے باہر نکلے اور مرزا غالب سے مصافحہ کیا۔

نامسن: تسلیم عرض کرتا ہوں مرزا صاحب

غالب: کورنس بجا لاتا ہوں

نامسن: آپ اندر تشریف کیوں نہیں لائے۔

غالب: دستور کے موافق آپ مجھ تاجیز کو لینے آتے، میں حاضر ہوتا۔

نامسن: (مسکرا کر) مرزا صاحب جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں

گئے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔

غالب: قبلہ گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ کر کے حاضر ہوا ہوں اور یہ امید تھی

کہ اس ملازمت سے کچھ عزت زیادہ ہو جائے، نہ اس لیے کہ ربی جی عزت میں فرق آئے۔

نامسن: میں قاعدے سے مجبور ہوں

غالب: (ہوادار کی طرف جاتے ہوئے) تو مجھے اس خدمت سے معاف رکھا

جائے تسلیم عرض ہے

نامسن: تشریف لے جائیے گا۔۔۔۔۔؟

غالب: ہوادار میں بیٹھ جاتے ہیں اور کباروں کو حکم دیتے ہیں کہ واپس گھر چلو،

واپس آنے تو کیا دیکھتے ہیں گھر کے باہر اپا جوں اور بھکاریوں کا جوم جمع ہے اور

بائرمین ان میں خیرات بانٹ رہی ہے۔ مرزا صاحب کو سخت حیرت ہوئی۔ جلدی

جلدی اندر داخل ہوئے۔ صحن میں پہنچے تو دیکھا کہ تخت پر امراؤ نیگم دو گانہ ادا

کرنے میں مشغول ہیں۔ انہوں نے سلام پھیرتے ہی مرزا صاحب کو مخاطب کیا۔

امراؤ: بیگم! الحمد للہ! کہنے خدا کا فضل ہو گیا
نالب: (نالب تخت پر بیٹھتے ہوئے) جی ہاں، ہو گیا
امراؤ: بیگم! کیا مطلب؟

نالب: مطلب یہ کہ ربی ہی عزت مٹی میں ملنے سے بچ گئی
امراؤ: بیگم! ہائیں! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ

نالب: (اٹھ کر تمکنت کے ساتھ) بیگم! عزت و ناموش کے لیے ہم نفل بچے
مر مٹنے والے ہیں۔ میں وہاں اس خیال سے گیا تھا کہ ملازمت سرکاری سے کچھ
اس عزت میں اضافہ ہو جائے گا مگر وہاں صاحب سکتر بہادر میرے استقبال کو باہر
نہ آئے۔ بھلا سوچو مجھے یہ بے عزتی کیسے گوارا ہو سکتی ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود ہیں کہ ہم
اٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہو
لیکن میں اپو چھتا ہوں یہ باہر خیرات کیسی بٹ رہی ہے۔
امراؤ: بیگم: (فکر مند ہو کر) کچھ نہیں

نالب: کچھ نہیں کیا تم تو ابھی کل ہی کہہ رہی تھیں کب تک گھر کا اس سہ سچ کر
مُزاران ہوگی۔

امراؤ: بیگم: (مسکرا دیتی ہے)
نالب: ارے بھئی کچھ تو بتاؤ؟

امراؤ نیگم: کیا بتاؤں۔۔۔؟ کل میں نے اپنا جڑاؤ گلو بند بی زمین سے گراؤ
 رکھوا کر کچھ روپے منگوائے تھے۔ شہر میں آپ کی ملازمت کا چرچا سن کر در پر یہ
 بھکاری جمع ہو گئے تو میں نے بی زمین سے کہا ”جاؤ ان کا سر صدقہ دے آؤ“
 غالب کھلکھا کر ہنس پڑتے ہیں امراؤ نیگم گہری سوچ میں پڑ جاتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی

کشمیر والے کٹڑے میں ایک چھت پر مرزا اسد اللہ خان (غالب) اور اس سے کچھ دور دوسری چھت پر کنور بلوان سنگھ پتنگ بازی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

اسد اللہ خان ہوا کا رخ دیکھتا ہے اور اپنے چھوٹے بھائی مرزا یوسف سے کہتا ہے ”یوسف ذرا وہ مال ہمہ دھڑ بڑھانا اس مانگ پائی پتنگ کی چات پھرت اچھی رہے گی۔ مرزا چھیلا کے ہاتھ کے کانپ ٹھنڈے چھلے ہوئے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے پتنگ کو ماہرانہ انداز سے دیکھا ”بڑا ہی زوردار پتنگ ہے“ اور ہنسی دھڑ سے مخاطب ہو کے کہا ”وہ دو بیٹے خانی چرخ جو چھوٹی تپائی پر دھڑی ہے لے لو اور اس پر یہ پتنگ بڑھاؤ۔“

ہنسی دھڑ نے پتنگ لیا اور مرزا یوسف نے چرخ اٹھا کر کہا ”لیکن بھائی جان! اس نخ کا مانجھا تو بہت کھردرا ہے“ اور ڈور پر ہاتھ پھیرنے لگا ”یہ تو ڈھیل پر اڑانے کی نخ ہے۔“

اسد اللہ نے ذرا بھنا کر کہا ”بھئی بلوان سنگھ زیادہ ڈھیل ہی کے پیچ لڑاتے ہیں کھینچ کے پیچ سے وہ بھاگتے ہیں میں نے خود اسی خیال سے مانجھا کھردرا رکھا لیا ہے۔“

مرزا یوسف بڑے بھائی کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

ادھر دوسرے کوٹھے پر کنور بلوان سنگھ سے اس کا دوست شمشیر سنگھ کہہ رہا تھا ”

کنے میں باندھ لوں یا آپ باندھ دیجئے گا“

بلوان نگہ نے آسمان میں اڑتے ہوئے پتنگوں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
تمہیں باندھ لو لیکن دیکھو دوہرے کنے ہوں پھر شیرنگہ کی طرف دیکھ کر تائیداً
کہا ”اور سنا تم نے اوپر سات اور نیچے پانچ گریں لگاتا۔ ہوا ذراتیز ہے اور پتنگ
بھی زوردار ہے۔“

شیرنگہ نے ایسا ہی کیا اور پتنگ بڑھا کر کنور بلوان نگہ سے کہا ”بلوان نگہ میں
تو کھینچ کے چٹ لڑاؤں گا تو۔۔۔ ہی۔ اس دو باز سے مرزا نوشہ کی جی بلوا دوں“
کنور مسکرایا اور اپنی نامعلوم مونچھوں کو تادے کر اسد اللہ خان کی طرف
دیکھا۔ جو اپنا پتنگ بڑھانے میں مشغول تھا اور پلا کر کہا ”کیوں مرزا نوشہ اس
مانگ پائی پتنگ سے تو مرزا چچیا کے ہاتھ کی ساخت ٹپک رہی ہے اور سجاوٹ بھی
انہی کے ہاتھ کی ہے خوب اڑائے لے رہا ہے۔“

ادھر سے اسد اللہ نے کہا ”تو اور کیا؟“

ادھر سے کنور بلوان نگہ چلایا ”مگر بھی سنا مرزا نوشہ میں کھینچ گھسیٹ کے چٹ
نہیں لڑاؤں گا۔ تم ٹھہرے سپاہی مار دھاڑ کی سوچتی ہے میں تو ڈھیل کے چٹ
لڑاؤں گا۔ کم از کم پھیٹی دو۔ پھیٹی نہ پر ہو تو وہاں ملانے کا مزا آتا ہے۔“

اسد اللہ نے پتنگ کو خوب ڈور پلائی اور بلوان نگہ کو جواب دیا ”کنور صاحب
آپ دو نہیں، تین پھیٹی پر پتنگ ملائے۔ آج اس پتنگ سے نو چٹ کاٹوں گا۔ نو
شیر و اپنا کے چھوڑوں گا۔“

یہ سن کر ہنسی دھڑا آگے بڑھا اور بلند آواز سے کہا ”کنور صاحب سنتے ہیں نو

بیچ تو مرزا نوشہ آپ کے سرچہ حائیں گے اور دتھواں گیا رتھواں میرے آپ کے بیچ لڑے گا۔ میں اس دوباز سے آپ کا پیٹا کاٹوں گا اور ایک کے کئے لوں گا۔“

بلوان بنگہ ہنسا ”الہ تمہارے تو چھیا رندی کئے لے گی تم مجھ سے کیا بیچ لڑا سکتے ہو اچھا رہی تم سے بھی آخر کے دو بیچ لڑیں گے۔“

ششیرنگہ چلایا ”نہی دھڑ تمہارے دو بازو کو تو بڑھاتے ہی باتھ پر کاٹوں گا تو
 یہی قلابازی کھاتا ہوا قلعے تک جائے وہاں کے تلوئے تمہارا ڈور لوٹیں اور تمہارا گن
 گائیں“

اس پر دونوں دوستوں نے خوب تمقہ لگائے ادھر اسد اللہ خاں نے جس کی آنکھیں اپنے دو باز پر جمی تھیں ہنسی دھر سے جو پتنگ بڑھا رہا تھا کہا ”ہنسی دھر ہوا کارخبر معلوم ہوتا ہے پتنگ ایک ہی ایٹمی پر بندول جانے لگا اچھا ماما۔“

تھوڑی دیر کے بعد پیچ مل جاتے ہیں لیکن بلوان سنگھ نے ذرا پتنگ روک کر ایک ایسا آڑا ہاتھ مارا کہ اسد اللہ خاں کٹ جاتا ہے۔ اس پر بلوان سنگھ اور اس کے ساتھی ایک شور برپا کر دیتے ہیں ”وہ کاٹا، وہ کاٹا مرزا فوشہ کٹ گئے“

اسد اللہ خان بگڑ جاتا ہے اور سارا نزالہ یوسف اور منشی دھتر پر گرتا ہے۔ منشی دھتر تمہاری جو بات ہے، بے عقلی سے خالی نہیں، گندھے نہیں گندھتوں کے سردار ہو تم نے بہت ہی کھر در مانجھا رکھوایا اور نہ یہ بیچ کٹنے والا تھا پھر مرزا یوسف پر بگڑنا شروع کیا ”یوسف تم نے بھی مجھ پر زور نہ دیا کہ بھائی جان اس سٹپر پتنگ نہ بڑھائے“

مرزا یوسف نے آہستہ سے جواب دیا ”بھائی جان میں نے تو عرض کیا تھا کہ

مانجھا بہت کھردرا ہے اور اس پر ڈھیل ہی کے پیچ لڑیں گے۔ اصل میں بلوان سنگھ نے دھوکا دیا پہلے کہا پیچ بھینٹی دو بھینٹی پر لڑیں گے اور کھینچ کر پیٹا کاٹ لیا۔“

بہنسی دھرنے چرخہ تپانی پر رکھی اور کہا ”چھوٹے مرزا سچ کہہ رہے ہیں“ مگر اسد اللہ جسے شکست نے جھنجھلا دیا تھا اور بگڑ گیا ”تم دونوں پتنگ بازی سے واقف ہی فقط نہیں بلکہ نرے کھرے بیوقوف ہوا لو کی دم ناختہ“

بہنسی دھرنے غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ”خیر اب جو ہو مانتا تھا ہو گیا آپ نے سینکڑوں پیچ کاٹے ہیں آج بلوان سنگھ نے دھاندلی کر کے ایک پیچ کاٹ لیا تو کیا ہوا۔“

بہت دیر کے بعد مرزا اسد اللہ خان کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور آخر میں یہ طے ہوا کہ چوسر کی ایک بازی رہے چنانچہ تینوں کو ٹٹھوں سے اترے اور گھر کا رخ کیا۔

مرزا اسد اللہ خان کے ماما خولہ غلام حسین خان زمان خانے سے باہر نکل رہے تھے کہ چلمن اٹھی اور امراؤ بیگم کی آواز آئی ماما جان آپ سے ایک بات کہنی تو بھول ہی گئی۔

خولہ غلام حسین نے اپنے قدم روک لئے اور پوچھا ”کیوں امراؤ بیگم خیر تو ہے“

امراؤ بیگم نے دروازے کی آڑ میں شرماتے ہوئے کہا ”ماما جان! آپ خان کو منع بھی نہیں کرتے۔“

”کسے بیٹا؟“

امراؤ بیگم اور زیادہ شرماتی ”خان ہی کو“

خولجہ صاحب سمجھ گئے ”میں سمجھا مرزا فوشہ کو“

”جی ہاں! آپ ان کو منع ہی نہیں کرتے، دن بھر چوسر کھیلتے رہتے ہیں

اور۔۔۔ اور شام کو روزانہ کنور بلوان لنگھ سے پتنگ بازی ہوتی ہے۔“

خولجہ صاحب نے سرد آہ بھری ”میں جانتا ہوں“

امراؤ بیگم نے دکھ بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا ”پیسہ اڑ رہا ہے اور ان کے

مزاج سے تو آپ واقف ہی ہیں میری مجال ہے جو میں اشارے کنائے میں بھی

اس بات کو ان پر جتاؤں۔“

خولجہ صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا ”ہاں بیٹی! میں بھی کئی دن سے

سوچ رہا تھا کہ اس کو مناسب طور پر سمجھائیں سو آج تم نے مجھے یاد دلادیا۔ میں

ضرور کہوں گا تم خاطر جمع رکھو۔“

امراؤ بیگم کو کچھ تسلی ہوئی ”حسنو! آپ ہی خیال کریں کہ اس طرح قارون کا

خزانہ بھی ہو تو خالی ہو جائے۔ ذرا نہیں سمجھتے کہ آج۔۔۔۔۔“ شرما جاتی ہے ہم دو

ہیں کل تین ہو جائیں۔ اپنے فضل و کرم سے کوئی نیا بندہ اللہ بھیج دے تو اس کی

پرورش تعلیم تبھی تو ہے۔

خولجہ صاحب مسکرائے ”خدا تیری زبان مبارک کرے“

”جب ہی تو میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ ان کو نصیحت کیجئے اگر سنیں گے تو وہ

آپ ہی کی سنیں مجھے تو وہ خاطر ہی میں نہیں لاتے۔“

خولجہ صاحب نے ڈیوڑھی کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا ”اچھا بیٹی! او میں

آج ہی کہتا ہوں۔“

خولجہ صاحب جو نبی ڈیوڑی میں پہنچے۔ ان کی اسد اللہ منشی دھڑ اور مرزا یوسف سے مڈ بھٹڑ ہو گئی جو کشمیرن والے کٹڑے سے آرہے تھے۔ خولجہ صاحب نے اسد اللہ کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ ”صاحب زادے! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے، ذرا دھڑ آؤ“ پھر یوسف اور منشی دھڑ سے کہا ”آپ دیوان خانے میں چل کر بیٹھئے یہ تموڑی دیر میں آتے ہیں۔“

منشی دھڑ اور مرزا یوسف چلے جاتے ہیں خولجہ صاحب وہیں ڈیوڑھی میں اسد اللہ خان سے مخاطب ہوتے ہیں۔ مرزا نوشہ میرے اس سوال کا جواب دو مجھے اپنا بھی خواہ سمجھتے ہو یا دشمن بدخواہ؟

اسد اللہ ٹپٹا گیا ”ماما جان! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں آپ نے مجھے پالا ہے، پرورش کیا ہے۔ آپ میرے بھی خواہ کیا معنی ولی نعمت ہیں۔“

خولجہ صاحب اور زیادہ سنجیدہ ہو گئے ”مرزا نوشہ! اب تمہاری عمر ماشاء اللہ سولہ سترہ کے لگ بھگ ہے لیکن تمہارا شغل اب سوائے دن بھر چوسر کھیلنے اور شام کو پتنگ اڑانے کے اور کچھ نہیں رہا۔ دولت برباد کر رہے ہو۔ بھائی! ہوش میں آؤ، کوئی مال حاصل کرو۔ نام و نمود پیدا کرو۔ اپنے بڑوں کی جائیداد میں اضافہ کرو“

خولجہ صاحب یہ کہہ ہی رہے تھے کہ سامنے سے مرزا اسد اللہ کے استاد مولوی عبدالصمد پارسا ایرانی آتے دکھائی دیئے۔ مرزا اسد اللہ بڑھ کر کورس بجالایا ”السلام علیکم“

اما عبدالصمد صاحب نے شفقت کے ساتھ جواب دیا ”زندہ باش“ خولجہ صاحب سے کہا ”مزاج مبارک“

خولجہ صاحب بھی مسکرائے ”الحمد للہ! ہر حال میں اللہ کا شکر ہے آپ خوب وقت پر آئے۔ میں آپ کے شاگرد کو کچھ نصیحت کر رہا تھا۔“

ملا صاحب ایک بار پھر اسد اللہ کی طرف دیکھ کر مسکرائے خولجہ صاحب نے کہنا شروع کیا ”میں اس سے کہہ رہا تھا کہ بھئی اب تم سولہ سترہ برس کے ہو گئے ہو ایک بچے کے باپ ہونے والے ہو، ذرا بیوہ کو کھیل کود سے ہاتھ اٹھاؤ۔ کچھ دنیا میں نام پیدا کرو کوئی مال حاصل کرو“

ملا عبد الصمد صاحب نے جنہیں غالباً اسد اللہ خان نے کوئی اشارہ کیا تھا اس سے کہا ”جاؤ بابا جاؤ میں خولجہ صاحب سے باتیں کر کے ابھی تمہارے پاس آتا ہوں“

اسد اللہ خان نے موقع غنیمت سمجھا اور وہاں سے کھسک گیا۔ اس کے بعد ملا صاحب خولجہ غلام حسین خاں سے مخاطب ہوئے ”جناب خولجہ صاحب! برا نہ مانئے تو ایک بات عرض کروں“

خولجہ صاحب نے فوراً ہی کہا ”نہیں برا مانئے کی کیا بات ہے آپ فرمائیے کیا ارشاد ہے؟“

ملا صاحب کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پیدا ہوئی ”مرزا نوشہ! آپ کی طرح کمیدان یا باپ دادا کی طرح رسالدار یا خان سے بھی زیادہ عہد و مفت ہزاری پر پہنچ کر سپہ سالار بھی ہو گیا تو کیا ایسوں کے نام ان کے ساتھ ہی مٹ جاتے ہیں مگر اسے تو ادب اور شعر کا انفراسیاب بننا ہے۔“

خولجہ غلام حسین کچھ چکرا سے گئے۔ ”آپ کی اس تقریر سے میں کچھ نہ سمجھا،

آپ کا مطلب کیا ہے؟“

ملا صاحب نے اپنا مطلب واضح کیا ”اسد اللہ خان بہت بڑا شاعر ہو گا اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آپ کا اور ہمارا نام اسی کی بدولت روشن ہو گا سو اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیجئے“

نولہ صاحب نے ملا عبدالصمد کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا ”ملا صاحب! میں تو حباب برآب ہوں اور آپ اپنے وطن ایران جا رہے ہیں باقی اگر آپ کا یہی خیال ہے کہ مرزا نوشہ فن شاعری میں نام پیدا کرے گا اور اس کا کلام قیامت تک باقی رہے گا تو یونہی ہی خدا ایسا ہی کرے آپ کے منہ میں کھلی اور شکر“

دونوں باتیں کرتے ہوئے دیوان خانے میں چلے گئے۔ ادھر ہنسی دھڑکے مکان میں چوسر بکھی ہوئی ہے اور اسد اللہ خان بری طرح اس کھیل میں محو ہے، ہنسی دھڑکے پانسہ پھینکا اور اسد اللہ خان سے کہا ”رنگ تو آپ سب لے گئے۔ بد رنگ میں یہ جو دو گولیں آپ کی باقی ہیں ان کے لیے ساری اپنی گولیں لے کر کھڑا ہو جاؤں گا اور آپ کو منزل مقصود تک پہنچنے دوں گا۔“

اسد اللہ خان مسکرایا؟ ”یہ گوٹ تو پاؤ بارہ یا سات چھ تیرہ سے اس گھر میں پہنچتی ہے۔ رجب دوسری تو وہ کچے بارہ سے گھر میں جاتی ہے اور دیکھو پھینکتا ہوں“

ہنسی دھڑکے متنبہ کیا ”پانسہ نہ بنا کر پھینکنے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں آپ اوپر تلے پانسے رکھ رہے ہیں۔“

اسد اللہ خان نے ہاتھ روک لیا اور ہنسی دھڑکے کہا ”اب روتے ہو“ پھر پانسہ پھینکا ”یہ پاؤ بارہ وہ مارا پاؤ بارہ لو کچے بارہ بھی لولو یہ کچے بارہ دیکھ لو کچے بارہ

دھڑے پڑے ہیں۔ یوں یہ پانسہ پھینکتے ہیں۔“

مرزا یوسف نے جو بغل میں بیٹھا تھا کہا ”بھائی جان! آپ کی پشت پر جوئی ہے جوئی“

اسد اللہ خان نے ذرا دون کی لی ”کہو، منسی دھڑ چھ تین نو پھینکوں؟“

منسی دھڑ مسکرایا ”چھ تین نو کہیں آئے نہ ہوں“

اسد اللہ خان نے بڑی پھرتی سے پانسہ پھینکا پر چھ تین نو نہ آئے۔ اسی پانسے پر بازی رکی پڑی تھی کہ اتنے میں خولہ غلام حسین صاحب کا ملازم گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اطلاع دی ”حضور! آپ کے ماما جان کی بری حالت ہے، دل پکڑے کراہ رہے ہیں۔“

اسد اللہ سخت متحیر ہوا ”ارے بھی ابھی ابھی تو میں ان کو ملا صاحب کے ساتھ اچھا بچھا چھوڑ کے آیا ہوں۔۔۔۔۔“ بازی کا خیال آیا تو زچ بچ ہو کر کہا ”اور یہاں بازی چھ تین نو پر رکی ہوئی ہے۔“

اسد اللہ خان اٹھنے لگا تو منسی دھڑ نے کہا ”مرزا نوشہ! اب دو ہاتھ میں میری ساری گوٹیں پونگ جاتی ہیں یا چھ تین نو پھینکتے جائیں یا ہار مان لیجئے“

اسد اللہ خان نے جواب دیا ”بھئی ماما جان کو دیکھ آؤں تم یونہی بازی کبھی رہنے دو“ اور ملازم کے ساتھ چلا گیا۔ گھر پہنچا تو ایک کھرام مچا ہوا تھا۔ خولہ غلام حسین بعارضہ دل انتقال کر چکے تھے۔

اپنے ماما جان کے انتقال کے بعد اسد اللہ خان کی اہالی طبیعت اور زیادہ رنگ لائی۔ امراؤ بیگم کی شکایتیں بڑھتی گئیں۔ آخر نواب احمد بخش اپنے چھوٹے

بھائی نواب الہی بخش خان معروف کے یہاں گئے اور کہا ”نواب احمد بخش مرزا نوشہ نے اپنے ماما کے مرتے ہی خوب ^{کھلے} چھڑے اڑانے شروع کیے ہیں میرے خیال میں اگر ان کا یہی عالم رہا تو جائیداد وغیرہ سب کنارے لگ جائے گی۔ جستجی اور بیٹی میں کیا فرق ہے جیسا مراؤ نیگم تمہاری بیٹی ویسی میری“

نواب الہی بخش نے باادب پوچھا ”تو پھر بھائی جان کیا کیا جائے؟“

نواب احمد بخش نے رائے دی ”یہ کیا جائے کہ تم مرزا نوشہ کو اپنے پاس بلا لو اور اپنی نگرانی میں رکھو“ اور پھر تاکید اکہا ”دیر نہ کرو جلدی جاؤ اور اس کو لے آؤ کہ اسی میں خیریت ہے۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ جو اس کو اور مرزا یوسف کو ملتا ہے، وہ بھی چٹ کر جاتا ہے اور میں سنتا ہوں۔ ماں سے الگ لیتا ہے اور ماما کی جائیداد ملاک پر بھی ہاتھ صاف کر رہا ہے یا کر چکا ہے۔ تم اس سے کہہ دینا کہ بھائی جان نواب احمد بخش صاحب کی بھی یہی رائے ہے کہ تم دلی چلے آؤ۔“

دونوں بھائیوں کے فیصلے کے مطابق مرزا اسد اللہ خان کو آخر آگرہ چھوڑ کر دلی جانا پڑ گیا۔ جہاں اپنے خسر نواب الہی بخش خان معروف کی نگرانی میں اس کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔



غالب اور چودھویں

مرزا غالب اپنے دوست حاتم علی مہر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ”مغل بچے بھی عجیب ہوتے ہیں کہ جس سے عشق کرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں میں نے بھی اپنی جوانی میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی سے عشق کیا اور اسے مار رکھا ہے۔“

1264ء میں مرزا غالب چوسر کی بدولت قید ہوئے۔ اس واقعے کے متعلق ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں ”کوٹوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف فتنہ گمات میں تھا اور ستارہ گردش میں باوجود یکہ مجسٹریٹ کوٹوال کا حاکم ہے میرے باب میں وہ کوٹوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔“

افسانہ نگار کے لیے یہ چند اشارے مرزا غالب کی رومانی زندگی کا نقشہ تیار کرنے میں کافی مدد دے سکتے ہیں رومان کی از تکون تو ”ستم پیشہ ڈومنی“ اور کوٹوال دشمن تھا کے مختصر الفاظ مکمل کر دیتے ہیں۔

ستم پیشہ ڈومنی سے مرزا غالب کی ملاقات کیسے ہوئی آئیے ہم تخیل کی مدد سے اس کی تصویر بناتے ہیں۔

صبح کا وقت ہے مرغ افواں میں دے رہے ہیں۔ مرزا نوشہ ہوادار میں بیٹھا ہے جسے چار کبار لئے جا رہے ہیں۔ مرزا نوشہ کی نشست سے پتہ چتا ہے کہ سخت افسردہ ہے۔ افسردگی کا باعث یہ ہے کہ اس نے مشاعرے میں اپنی بہترین غزل سنائی مگر حاضرین نے داد نہ دی۔ ایک فقط نواب شفیعہ نے اس کے کلام کو سراہا۔ صدرالدین آزاد نے اس کی حوصلہ افزائی کی لیکن بھرے ہوئے مشاعرے میں

دو آدمیوں کی داد سے کیا ہوتا ہے۔ مرزا نوشتہ کی طبیعت اور بھی زیادہ مکدر ہوئی تھی۔ جب لوگوں نے ذوق کے کلام کو صرف اس لیے پسند کیا کیوں کہ وہ استاد شاہ تھا۔

مشاعرہ جاری تھا مگر مرزا نوشتہ اٹھ کر چلا آیا وہ اور زیادہ کوفت نہیں اٹھا سکتا تھا۔

مشاعرے سے باہر نکل کر وہ ہوادار میں بیٹھا کہا روں نے پوچھا ”حضور، کیا گھر چلیں گے؟“ مرزا نوشتہ نے کہا نہیں، ہم ابھی کچھ دیر سیر کریں گے، ایسے بازاروں سے لے چلو جو سنسان پڑے ہوں۔

کہار بہت دیر تک مرزا نوشتہ وک اٹھائے پھرتے رہے، جس بازار سے بھی گزرے، وہ سنسان تھا۔ چودھویں کا چاند غروب ہونے کے لیے نیچے جھک گیا تھا۔ اس کی روشنی اداس ہو گئی تھی۔

ایک بہت ہی سنسان بازار میں ہوادار گزر رہا تھا کہ دور سے سارنگی کی آواز آئی بھیرویں کے سر تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی عورت کے گانے کی تھکی ہوئی آواز آئی مرزا نوشتہ چونک پڑا اسی کی غزل کا ایک مطلع بھیرویں کے سروں پر تیر رہا تھا۔

نکتہ جیس ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
آواز میں درد تھا، جوانی تھی لیکن یہ مطلع ختم ہوتے ہی آواز ڈوب گئی۔
دور ایک کوٹھے پر ملکہ جان جمائیاں لے رہی ہے۔ چاندنی بچھی ہوئی ہے۔

اس کی سلوٹوں سے اور موتیے اور گلاب کی بکھری اور مسلی ہوئی پتیوں سے پتہ چتا ہے کہ محض رقص و سرود کو ٹھنڈے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے۔

ملکہ جان نے ایک لمبی جمائی لی اور اپنا ضعیف بدن جھٹک کر اپنی سانولی سلونی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی نوچی سے جو گاؤں تکیے پر سر رکھے اپنی خروٹلی انگلیاں چٹا رہی تھی کہا ”مون ہے، شیفتہ ہے، آرزوہ ہے استاد شاہ ذوق ہے۔۔۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا کل کے اس مبتدی شاعر غالب کے کلام میں کیا دھڑا ہے کہ جب نہ تب تو اسی کی غزل گائے گی!“

نوچی مسکرائی اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی ایک سرد آہ بھر کر اس نے کہا

”دیکھنا“ اقریر کی لذت کو جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ ملکہ جان نے پہلے سے بھی زیادہ لمبی جمائی لی اور کہا ”بھئی اب سو بھی چکو بہت راہ دیکھی جمعہ ارحشمت خان کی۔“

شوخی چشم نوچی نے انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر بازو اوپر سے لے جا کر ایک جمائی لیتے ہوئے کہا

”بس اب آتے ہی ہوں گے میں تو ان سے کہا تھا کہ مرزا غالب کے آگے سے جو نہیں منع ہے وہ ان کی غزل کی نقل لے کر چلے آئیں“

ملکہ جان نے برا سامنہ بنایا ”اس گھوڑے مرزا غالب کے لیے اب تو اپنی نیندیں بھی حرام کرے گی تو“

نوچی مسکرائی سامنے فدن میاں سارنگی پر ٹھوڑی ٹکائے پینک میں اونگھ رہا تھا۔

نوچی نے طنبورہ اٹھایا اور اس کے تار ہولے ہولے چھیڑنا شروع کیے پھر اس کے حلق سے خود بخود اشعار راگ بن کر نکلنے لگے۔

نکتہ چیس ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
فدن میاں ایک دم چونکا آنکھیں مندی رہیں لیکن سارنگی کے تاروں پر اس کا
گزر چلنے لگا

میں بلاتا تو ہوں ان کو مگر اے جذبہ دل
ان پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
گانے والی کی تسکین نہ ہوئی چنانچہ اس نے شعر کو یوں گانا شروع کیا
میں باقی تو ہوں ان کو مگر اے جذبہ دل
ان پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
ملکہ جان ایک دم چونکا اس نے نوچی کو اشارہ کیا وہ بھی چونک پڑی سامنے
دبلیز پر مرزا نوشہ ایستادہ تھا۔ ملکہ جان فوراً اٹھی اور تسلیمات بجا لائی نوچی نے بھی
اٹھ کر کھڑے قد تعظیم دی، یہ جان کر کہ شہر کے کوئی رئیس ہیں۔ ملکہ استقبال کے
لیے آگے بڑھی ”آئیے آئیے! تشریف لائی زہے قسمت کہ آپ ایسے رئیس مجھ
غریب کو مرفراز فرمائیں آپ کے آنے سے میرا گھر روشن ہو گیا۔“

مرزا نوشہ نے حسن ملیح کے مادرِ نمونے کی طرف دیکھا نوچی نے جھک کر کہا ”
آئیے ادھر مسند پر تشریف رکھیے“

مرزا نوشہ ذرا تامل کے بعد بیٹھ گیا اور کہنے لگا ”تمہارا گلا بہت سریا ہے اور

مرزا نوشہ مسکرایا ”بھاؤ بتا کے گاؤ تو کچھ بھاؤ کے انگوں سے شاید سمجھ لوں“
اب چودھویں کو جگت سو جھسی، چلی سی ناک چڑھا کر کہا ”بھاؤ کا بھاؤ مہنگا
پڑے گا“

مرزا نوشہ ایک لٹلے کے لیے خاموش ہو گیا پھر چودھویں سے مخاطب ہوا
 ”آپ کو غالب کا کلام بہت پسند ہے؟“

ملکہ جان جو ابھی تک خاموش بیٹھی تھی۔ مرزا نوشہ سے مخاطب ہوئی ”حضور! کئی بار کہہ چکی ہوں اس سے کہ ذوق ہے، مومن ہے، نصیر ہے، شیفہ ہے، سب مانے ہوئے استاد ہیں پر اسے نہ جانے اس عطائی غالب کے کلام میں کیا خاص بات نظر آتی ہے کہ آپ مومن کی فرمائش کریں گے اور یہ غالب شروع کر دے گی۔“

مرزا نوشہ نے مسکرا کر چودھویں کی طرف دیکھا اور کہا ”ایسی کوئی خاص بات ہوگی؟“

چودھویں سنجیدہ ہو گئی ”یہ تو وہی“ مجھے جس کو لگی ہو،“
مرزا نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا ”کیا میں سن سکتا ہوں وہ آپ کے دل کی لگی
کیا ہے؟“

چودھویں نے سرد آہ بھری ”نہ پوچھئے کہاں میں غریب ڈومنی کہاں غالب۔۔۔۔۔ جانے دیجئے اس بات کو۔۔۔۔۔ کہنے آپ کس کی غزل سنیں گے؟“

مرزا نوشہ مسکرایا ”غالب کی اور کہنے تو میں آپ کو غالب کے پاس لے

چلوں۔ چودھویں کے چاند کا برج اسد میں طلوع ہو جائے،
چودھویں اس کا مطلب نہ سمجھی ”مجھ ایسی کو وہ کیا پوچھیں گے خاک ہو جائیں
گے ہم ان کو خبر ہونے تک۔“

مشاعرے میں مرزا نوشہ کو جو کوفت ہوئی تھی۔ اب وہ بالکل دور ہو چکی تھی ان
کے سامنے سانوے سانوے رنگ کی موٹی موٹی آنکھوں والی لڑکی بیٹھی تھی جس کو
اس کے کلام سے والہانہ محبت تھی یہ کیوں اور کیسے پیدا ہوئی؟ مرزا نوشہ بہت دیر
تک گفتگو کرنے کے باوجود بھی نہ جان سکا۔ آخر میں مرزا نوشہ نے اس سے
پوچھا ”کیا تم نے کبھی غالب کو دیکھا ہے؟“

چودھویں نے مختصر سا جواب دیا ”نہیں“
مرزا نوشہ نے کہا ”میں انہیں جانتا ہوں بہت ہی بگڑے رئیس ہیں تم چاہو تو
میں انہیں لاستا ہوں یہاں“

چودھویں کا چہرہ متمتا اٹھا ”جج؟“
مرزا نے کہا ”میں کوش کروں گا“ اور یہ کہہ کر جیب سے ایک کاغذ نکالا ”میرا
کلام سنو گی؟“

چودھویں نے رسمی طور پر کہا ”سنائیے ارشاد“
مرزا نوشہ نے مسکرا کر کاغذ کھولا ”یوں تو میں بھی شعر کہہ لیتا ہوں پر تمہیں تو
غالب کے کلام سے محبت ہے میرا کلام تمہیں کیا پسند آئے گا؟“
چودھویں نے پھر رسمی طور پر کہا ”جی نہیں، کیوں پسند نہ آئے گا آپ ارشاد
فرمائیے“

مرزا نوشہ نے ابھی اس غزل کے دو ہی شعر سنائے ہوں گے جو اس نے
مشاعرے میں پڑھی تھی کہ چودھویں نے ٹوک کر پوچھا ”آپ اس مشاعرے
میں شریک تھے جو مفتی صدر الدین آرزو دہ کے یہاں ہو رہا تھا“

مرزا نوشہ نے جواب دیا ”جی ہاں“

چودھویں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا ”غالب تھے؟“

مرزا نوشہ نے جواب دیا ”جی ہاں!“

چودھویں نے اور زیادہ اشتیاق سے کہا ”کوئی ان کی غزل کا شعر یاد ہو تو
سنائیے؟“

مرزا نوشہ نے افسوس ظاہر کیا اور کہا ”اس وقت کوئی یاد نہیں آ رہا“

اس نے اب مذاق کو اور زیادہ طول نہ دینا چاہا۔ ایک گلوری چودھویں کے
ہاتھ کی بنی ہوئی لی۔ خاص دان میں ایک اشرفی رکھا اور رخصت چاہی۔

کوٹھے سے نیچے اتر اتو میٹر میوں کے پاس مرزا نوشہ کی مڈ بھیڑ جمعدار حشمت
خان سے ہوئی جو مشاعرے سے واپس آ رہا تھا۔ حشمت خان اس کو دیکھ کر بھونچکا
رہ گیا ”مرزا نوشہ آپ یہاں کہاں؟“

مرزا نوشہ خاموش رہا حشمت خان نے معنی خیز انداز میں کہا ”تو یہ کہنے کہ آپ
کا بھی اس وادی میں کبھی کبھی گزر رہوتا ہے؟“

مرزا نوشہ نے مختصر سا جواب دیا ”فقط آج اور وہ بھی اتفاق سے خدا حافظ“

یہ کہہ کر وہ ہوادار میں بیٹھ گیا۔ حشمت خان اوپر گیا تو چودھویں دیوانہ وار اس
کی طرف بڑھی ”کہنے غالب کی غزل لائے؟“

